تعلیم و تربیت

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے
سرورق: یوم دفاع

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

پاکستان کی سلامتی کے لیے دو مواقع کڑی آزمائش کے گزرے ہیں۔ پہلا موقع وہ تھا جب پاکستان بن رہا تھا اور دوسرا موقع وہ تھا جب 6 ستمبر 1965ء کو بھارت نے اچانک پاکستان پر حملہ کر دیا تھا، مگر دونوں مرتبہ دشمن کو منہ کی کھانی پڑی اور پاکستان بخیر و بخوبی آزمائشوں سے گزر گیا۔ بھارت نے 6 ستمبر 1965ء کو پوری فوجی طاقت سے پاکستان پر حملہ کر دیا تاکہ پاکستان کو ختم کر کے پرانی خواہش پوری کر سکے۔ اس حملے کی کئی وجوہات تھیں۔

سب سے بڑی وجہ ہندوؤں کی اسلام دشمنی ہے۔ وہ ایک ہزار سال سے مسلمانوں کے محکوم رہے اور انگریزوں کے جانے کے بعد وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو غلام بنا لیں۔ وہ ہندوستان کی تقسیم کے سخت مخالف تھے اور "اکھنڈ بھارت" یعنی متحدہ ہندوستان ان کا نعرہ تھا۔ آزادی کے بعد بھارت نے کئی ریاستوں (جوناگڑھ، مناوادر، حیدر آباد دکن اور کشمیر) پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ یہ ریاستیں خود مختار بننا چاہتی تھیں یا پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کر چکی تھیں۔ 1962ء میں نیفا کے علاقے میں بھارت نے چین سے زبردست شکست کھائی تھی۔ وہ اس بدنامی کے داغ کو پاکستان کو زیر کر کے دھونا چاہتا تھا۔ بھارت کو اپنی فوجی طاقت پر بڑا غرور تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ آسانی سے پاکستان کو شکست دے دے گا۔

حملے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ صوبہ سندھ کے ریگستانی علاقے رن کچھ میں بھارت نے چند پاکستانی چوکیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ چوکیاں ہندوستان کی تقسیم کے وقت سے پاکستان کے پاس تھیں اس لیے ہماری فوجوں نے جوابی حملہ کر کے نہ صرف ان چوکیوں کو واپس لے لیا بلکہ کچھ بھارتی علاقے پر بھی قبضہ کر لیا۔ ساری دُنیا میں بھارت کی بڑی ذلت ہوئی اور اس کے رہنماؤں نے دھمکی دی کہ اب وہ اپنی پسند کا محاذ کھولیں گے۔ انہوں نے کشمیر میں زبردست فوج جمع کر لی اور 15 اگست کو ٹیٹوال، کارگل اور حاجی پیر کی پاکستانی چوکیوں پر قبضہ کر لیا اور آزاد کشمیر میں لوٹ مار شروع کر دی۔ پاکستانی فوجوں نے جوابی کارروائی کی اور چھمب جوڑیاں کا وسیع علاقہ تین دن میں فتح کر لیا۔ یہ شکست بھارت کے لیے اور بھی شرم کا باعث بنی اور اس نے جنگ کا اعلان کیے بغیر 6 ستمبر 1965ء کو منہ اندھیرے لاہور کے محاذ پر کئی اطراف سے حملہ کر دیا۔ دشمن کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملانے کے لیے ستمبر کی سترہ روزہ جنگ میں پاکستان کی بہادر فوجوں نے شجاعت کے جو جوہر دکھائے، وہ پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔

اسی ماہ 11 ستمبر 1948ء کو ہمارے محبوب قائد اور بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح ہم سے جدا ہوئے۔ آپ پاکستان کے عظیم محسن تھے۔ آپ اور آپ کے رفقاء کی انتھک محنت اور عظیم کوششوں سے ہمیں یہ پیارا وطن پاکستان ملا۔ خدا تعالیٰ ہمارے قائد کے درجات بلند فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام دے۔ (آمین!) ان سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر پاکستان کو مضبوط و خوش حال بنائیں۔

ستمبر میں تمام مدارس، سرکاری و غیر سرکاری گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد کھل جاتے ہیں۔ آپ اپنی تمام تر توجہ تعلیم اور ملکی ترقی پر مرکوز رکھیں اور دُنیا کے اس ہجوم میں کوئی واضح شناخت اور نمایاں پہچان حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

لیجیے، اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی تنقید و تجاویز سے آگاہ کریں۔ آپ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام
اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر
سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 1000 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔
ایشیاء، افریقہ، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے)= 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 35 روپے

حمدِ باری تعالیٰ

میں ہوں اس قابل کہاں کر پاؤں جو حمد و ثنا
چند ادنیٰ کوششوں کو تو کر پذیرائی عطا
کوئی ساتھی ہو نہیں سکتا کسی کا بن تیرے
ہو کرم آقا عطا رحمت تیری برسے سدا
ہو گئی دنیا میں پست اپنی کج روی سے میں
ان گنت عیبوں کو میرے پردہ دینا یا شاہا
خدمت دیں بن سکے میرا اور سب کا نصیب
عمر کے لمحات گزریں یاد میں تیری سدا
میری کیا پہچان ہے؟ جو پا سکی نہ تیرا در
مجھ کو یہ دولت خدایا کرنی ہے تو نے عطا
لاغری و بے بسی سے میں نہیں ہوں مضطرب
تیری ہوں گی رحمتیں تو ہر درد ہو گا جاں فزا
شامتِ اعمال سے جب بھی گھری یاس میں
تو نے بخشا حوصلہ پھر سے مجھے میرے خدا
بھولنے کے تجھ کو لمحے ہوں نسیم پر حرام
ہے یہی میری تمنا اور میرے دل کی صدا

نعت رسولِ مقبول ﷺ

ہر اک بے نوا کو سہارا ملے
ہر اک ڈوبتی کو کنارہ ملے
خوشی آئے میری بھی آنکھوں میں اس دم
جو روضے کا ان کے نظارا ملے
سبھی عاصیوں کی اُمیدیں لگی ہیں
شفاعت کی ان کا اشارہ ملے
گنہگار ہوں پر مقدر پہ نازاں
کہ نام اُمتیوں میں ہمارا ملے ان شاء اللہ
بلا لو مجھے اب تو اے کملی والے
مقدر کو میرے ستارہ ملے
میری جھولی خالی ہے سن لو صدائیں
کوئی اور بھی نہ دوارہ ملے
یہ وعدہ خدا کا ہے بندوں سے اپنے
محمد سے ہی دین سارا ملے
نسیم ان کی سنت پہ ہر اک چلے جو
جہاں میں نہ کوئی بے چارہ ملے

کج روی: اُلٹے راستے پر چلنا — عاصی: گناہ گار
جاں فزا: دل خوش کرنے والا — دوارہ: دروازہ، چوکھٹ
پذیرائی: مقبولیت

بچوں کا جانوروں کے ساتھ اُنس اور محبت ایک قدرتی بات ہے۔ بقر عید کے موقع پر بچوں کا یہ جنون اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ بچوں کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے ابو جی کو منا لیا جائے کہ وہ جلد از جلد قربانی کا جانور گھر لے آئیں تاکہ ہمارا زیادہ سے زیادہ وقت جانور کی خدمت میں گزر سکے۔ پھر جب ابو جی قربانی کا جانور گھر لے آتے ہیں تو بچوں کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ پھر وہ اپنے جانور کی خاطرداری میں لگ جاتے ہیں۔ کبھی اس کو چارہ کھلانا، کبھی پانی پلانا اور کبھی سیر پر لے جانا۔ کیوں بچو! ایسا ہی ہوتا ہے نا؟

پیارے بچو! آپ گلی کوچوں میں ایک منظر اور بھی تو دیکھتے ہیں کہ بچوں نے ایک بے زبان جانور کو تختہ مشق بنایا ہوتا ہے۔ کوئی دم مروڑ کر اس کو چابی بھرتا ہے یا چھڑی سے مارتا ہے تو وہ جانور بدک جاتا ہے اور غصے سے سر ہلاتا، آنکھیں دکھاتا بچوں کی جانب بڑھتا ہے۔ اب بچوں کی فوج آگے آگے اور وہ جانور پیچھے پیچھے بھاگتا دکھائی دیتا ہے۔ یوں بھاگ بھاگ کر بچے خود بھی ہلکان ہوتے ہیں اور اپنے جانور کو بھی اذیّت پہنچاتے ہیں۔ اپنے اور جانور کے گرنے اور چوٹ لگنے کا خدشہ بھی بدستور موجود ہوتا ہے، اور اگر کوئی بچہ اس منہ زور جانور کی زد میں آ جاتا ہے تو پھر اس کو ایک ایسی ٹکر رسید ہوتی ہے کہ اس کو نانی اماں یاد آ جاتی ہیں۔

نہ بچو نہ!! ایسا نہیں کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کے بھی حقوق رکھے ہیں جن کا خیال رکھنا ہمارے لیے بے حد ضروری ہے۔

1- جانور کو غذا پوری اور بروقت دی جائے۔ روایت میں آتا ہے کہ ”ایک عورت کو ایک بلی کی وجہ سے عذاب ہوا کہ اس نے بلی کو پکڑ رکھا تھا، یہاں تک کہ وہ بھوک سے مرگئی، یہ عورت نہ اسے کھانے کو خود کچھ دیتی اور نہ اسے چھوڑتی کہ حشرات الارض سے اپنی غذا حاصل کرلیتی۔“ (مسند احمد 7874)

اسی طرح ایک مرتبہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک اونٹ نے اپنے مالک کی شکایت کی کہ وہ مجھ سے کام زیادہ لیتا ہے اور خوراک کم دیتا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اونٹ کے مالک کو اس سے اچھا برتاؤ کرنے کی تلقین فرمائی۔ (مسند احمد 17565)

2- جانوروں کو آپس میں لڑایا نہ جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جانوروں کو آپس میں لڑانے سے منع فرمایا۔ (ترمذی 1708)

3- جانور کو بُرا بھلا نہ کہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ”مرغ کو بُرا بھلا نہ کہو کیوں کہ وہ نماز کے لیے جگاتا ہے۔“ (ابوداؤد 5101)

4- جانور کے گلے میں پٹا ڈالنے کا حکم دیا اور رسّی ڈالنے سے منع فرمایا۔

5- جانور کو کس کر نہ باندھا جائے جس سے گلا گھوٹنے یا رسّی گلے میں بھر جانے کا اندیشہ ہو، اس سے بھی حدیث میں منع فرمایا گیا ہے۔

6- جانوروں کو بلاوجہ دوڑانا اور ان پر سختی کرنا بھی درست نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حج کے موقع پر میں آپؐ کے ساتھ چل رہا تھا کہ آپؐ نے پیچھے سے اونٹوں کو مارنے اور سختی سے ہانکنے کی آواز سنی، تو آپؐ نے پیچھے مُڑ کر ان کو تنبیہ فرمائی کہ اے لوگو! اطمینان سے کام لو کیوں کہ (سواری کا) دوڑانا نیکی نہیں ہے۔ (بخاری 1671)

7- جانور کی خوب خدمت کی جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: کیا جانوروں کو کھلانے پلانے میں بھی ہمارے لیے اجر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہر جانور کی خدمت میں اجر ہے۔ (بخاری 2466)

پیارے بچو! جانور اللہ تعالیٰ کی بے زبان مخلوق ہیں، ان کو ستانا اور ترسانا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بھی حقوق رکھے ہیں جیسا کہ اوپر بیان کیے ہیں۔ پس آپ ان کا خیال کیجیے اور رب تعالیٰ سے اجر لیجیے۔

☆☆☆

عجیب لڑکی

نایاب بہت پیاری مگر تھوڑی سی عجیب لڑکی تھی۔ وہ اپنے کھلونوں کا بہت خیال رکھتی تھی، خاص طور پر اپنی پیاری گڑیا کا، مگر خدا کی پناہ اسے اپنی کتابوں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ اپنی کتابوں میں سے صفحے نکالنا اور پھر انہیں ریزہ ریزہ کر کے اپنے کمرے کے فرش پر گرانا، اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں تنہا ہوتی، اپنی کتابوں کی الماری سے کسی تصویر والی کتاب کا انتخاب کرتی، فرش پر بیٹھ کر اس کتاب میں سے سب سے بہترین تصویر چنتی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ تصویر کئی حصوں میں تقسیم ہو جاتی۔

نایاب کی امی اس کی اس عادت سے بہت نالاں تھی۔ انہوں نے نایاب کو کئی دفعہ پرانے اخبار دیئے کہ وہ بیٹھ کر انہیں پھاڑتی رہے مگر کتابوں کو پھاڑنے سے جو تسلی اسے ہوتی تھی، وہ اخباروں کو پھاڑنے میں کہاں۔ پھر ایک دن ایک حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا۔ نایاب گھر کی اوپر والی منزل پر واقع اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ کمرے میں مدھم روشنی جل رہی تھی اور شام ہو چکی تھی۔

نایاب حسب سابق اپنی کتابوں کی الماری کے پاس گئی، اس میں سے اپنی سب سے خوب صورت اور بڑے سائز کی نظموں والی کتاب نکالی، حالاں کہ اس کی امی نے اسے اس کتاب کو ہاتھ لگانے سے بھی منع کر رکھا تھا۔ بڑے دنوں سے نایاب کے ہاتھ میں گویا کھجلی ہو رہی تھی کہ کسی طرح وہ اس نظموں والی کتاب کی تصویروں میں موجود کرداروں کے ٹکڑے ٹکڑے کرے اور انہیں فرش پر گرائے۔ نایاب نے اس کتاب کو اُٹھا کر کھولا تو پہلے صفحہ پر ایک ادھیڑ عمر عورت اپنا جوتا دیکھ رہی تھی جو اس کے پاس زمین پر پڑا تھا۔ جیسے ہی اس نے چاہا کہ تصویر والے جوتے کے دو ٹکڑے کر دے، اس کی طبیعت بھاری سی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں جیسے نیند سے بوجھل ہو گئیں۔

نایاب نے بار بار اپنی آنکھیں جھپکیں لیکن اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ اسے لگا جیسے تصویر والی عورت کا جوتا تصویر سے باہر نکل آیا ہے اور وہ سائز میں بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ تصویر والی عورت بھی بڑی ہوتی جا رہی ہے۔ نایاب کو اس کا منہ کھلتا اور بند ہوتا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کچھ بڑبڑا رہی ہے۔ نایاب کو اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے بچوں کو بلا کر کہہ رہی تھی کہ شرارتوں سے باز آ جاؤ! میں نے تمہارے بستر بچھا دیئے ہیں، آ کر لیٹ جاؤ! اسی اثناء میں جوتا اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ اس نے نایاب کا آدھا کمرہ گھیر لیا تھا۔ پھر نایاب نے کچھ بچوں کو جوتے کے گرد دوڑتے دیکھا۔ وہ ہنس رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ ان کو متوجہ کرنے کے لیے عورت نے تالی بجائی

اور زور سے بولی کہ فوراً ادھر آؤ۔

اتنی دیر میں تین بچے دوڑتے ہوئے نایاب کے پاس پہنچ گئے تھے اور اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ حیرت سے ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ یہ کیسی عجیب وغریب لڑکی ہے۔ ایسے لگتا ہے گویا اخبار کے کاغذ سے بنی ہو۔ نایاب نے فوراً اپنا آپ دیکھا تو ششدر رہ گئی۔ اسے بھی واقعی خود کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ بہت ہی باریک ہوگئی تھی، اتنی باریک جتنا اخباری کاغذ۔ وہ بالکل ایسے لگ رہی تھی جیسے کوئی تصویر کسی کتاب سے نکالی گئی ہو۔

بچے ماں کو پکارنے لگے کہ وہ آ کر دیکھے کہ یہ کیسی عجیب لڑکی ہے جو کاغذ سے بنی ہے۔ عورت اپنے جوتے نما گھر سے نکلی اور جلدی سے نایاب کی طرف لپکی۔ اس نے نایاب کے قریب پہنچ کر اسے تعجب سے گھورا اور اسے گویا پہچان کر بولی۔ ''ارے، یہ تو وہی شرارتی لڑکی ہے جس کے متعلق ہر جگہ مشہور ہے کہ وہ اپنی بہترین کتابوں میں سے ساری خوب صورت تصویریں نکال کر پھاڑ دیتی ہے۔ اسے اپنے کیے کی سزا ملی ہے اور یہ خود ہی کاغذ کی بن گئی ہے۔'' بچے چلائے کہ پھر اسے بھی اس طرح پھاڑنا چاہیے جس طرح یہ تصویروں کو پھاڑتی تھی اور اسے تکلیف بھی نہیں ہونی چاہیے، اگر واقعی یہ کاغذ سے بنی ہوئی ہے۔

نایاب ان کی باتیں سن کر خوف زدہ ہوگئی اور انہیں روکنے لگی کہ وہ اسے ہاتھ نہ لگائیں کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ اسے تکلیف ہو گی۔ ایک چھوٹے بچے نے نایاب کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا۔ ''آزمانے میں کیا حرج ہے۔ تم ہمیشہ کتابوں میں چھپے کرداروں کو پھاڑتی رہی ہو، اب تمہاری باری ہے۔''

نایاب نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور چھڑوایا اور دھمکی دی۔ ''اگر تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں شور مچا کر اپنی امی جان کو بلا لوں گی۔''

''لیکن وہ تو یہاں نہیں ہیں۔ یہاں صرف ان کی ماں ہے۔ اگر تم نے شور مچایا تو سزا کے طور پر وہ تمہیں زبردستی بستر میں گھسیڑ دیں گی اور اُٹھنے نہیں دیں گی۔'' بچوں نے اس کی دھمکی نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

نایاب نے کہا۔ ''میں تو کاغذ کی بنی ہوئی نہیں ہوں اور اگر میں اس وقت کاغذ کی بنی ہوئی لگ بھی رہی ہوں تو میں نے دوبارہ ٹھیک ہو جانا ہے اور اگر تم نے میرا بازو علیحدہ کر دیا تو پھر میں کبھی ٹھیک نہیں ہو سکوں گی۔ مہربانی فرما کر مجھے نقصان نہ پہنچانا۔'' نایاب نے بچوں کی منت کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم ہمیشہ یہی کام خود کرتی رہی ہو، اب ہمیں کیوں منع کرتی ہو۔'' بچوں نے ڈھٹائی سے کہا تو نایاب نے بچوں سے کہا کہ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے، وہ اس غلطی کو اب کبھی نہیں دہرائے گی۔ اتنی دیر میں ایک بڑا بچہ خاموشی سے نایاب کے عقب میں گیا اور نایاب کی فراک پھاڑ دی۔ آواز ایسی آئی جیسے کوئی اخبار پھٹا ہو۔ بے چاری نایاب کی چیخ نکل گئی۔ ''او! شرارتی بُرے لڑکے، تم نے میرا اتنا خوب صورت فراک پھاڑ دیا ہے۔'' نایاب کی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ وہ

آگے بڑھی اور اس نے بڑے بچے کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ وہ درد سے چلایا اور اس نے تھپڑ کے جواب میں نایاب کو ایک مکا رسید کر دیا۔ وہ رونے لگی تو دوسرے بچے چلانے لگے۔

عورت جوتے والے گھر سے نکلی، وہ غصے میں تھی۔ اس نے بچوں کو باری باری پکڑا اور جوتے والے گھر میں دھکیلنے لگی۔ ''اب تمہیں سالن میں گوشت کی بجائے صرف شوربہ ملے گا۔ پھر تمہاری پٹائی کروں گی اور تمہیں بستر میں ہی لیٹنا ہوگا۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''اُف یہ لڑائی، مجھے تو تمہاری حرکتوں پر سخت شرمندگی ہے۔'' اس نے نایاب کو بھی پکڑا لیکن نایاب کسی صورت بھی جوتے والے گھر میں قیدی نہیں بننا چاہتی تھی۔ وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ عورت نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس کے ہاتھ میں نایاب کے فراک کا ایک کونا آگیا۔ عورت نے نایاب کو بھی جوتے والے گھر میں دوسرے بچوں کی طرح دھکیل دیا۔

نایاب نے فرار ہونے کے لیے گھر کا جائزہ لیا لیکن عورت نے جوتے والے گھر کا دروازہ بند کر دیا۔ اتنے میں نایاب کو ایک اور دروازہ دکھائی دیا اور وہ وہاں سے بھاگ نکلی۔ عورت پکارتی رہ گئی مگر نایاب اس کی دسترس سے نکل چکی تھی۔ نایاب جلدی سے سیڑھیاں اُترنے لگی تو اچانک کسی سے اس کی ٹکر ہوگئی۔ ''کیا ہوا نایاب بیٹا! کیوں گھبرائی ہوئی ہو؟'' وہ اس کی امی جان تھیں جو اسے گھبرائے ہوئے دیکھ کر خود بھی پریشان ہوگئی تھیں۔ اس نے ہڑبڑا کر دیکھا تو وہ بالکل پہلے جیسی ہو چکی تھی۔ اس جگہ اندھیرا تھا، اسے یقین نہیں آیا کہ وہ ٹھیک ہوگئی ہے۔ اس نے امی سے کہا کہ کہیں وہ کاغذ سے تو نہیں بنی ہوئی۔ اس نے امی کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ ''تم خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی؟''

نایاب کی ماں اس کا ہاتھ تھامے سیڑھیاں چڑھ کر دوبارہ اس کے کمرے میں آگئیں۔ بتی کو روشن کیا اور اسے کہنے لگیں کہ وہ بالکل گوشت پوست کی بنی انسان ہے، کاغذ کی نہیں۔ تب نایاب نے اطمینان کا سانس لیا لیکن پھر امی جان سخت ناراض ہونے لگیں کیوں کہ نایاب کا خوب صورت فراک دو جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ ان کے پوچھنے پر نایاب نے انہیں بتایا کہ ایک لڑکے اور اس کی ماں نے اسے پھاڑا ہے مگر ظاہر ہے کہ امی جان اس کے کہے کا یقین نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے اس کی سخت سرزنش کی۔ ''تم بُری بچی ہو، تم نے کاغذی تصویروں کے علاوہ کپڑے بھی پھاڑنے شروع کر دیئے ہیں۔ مجھے تمہیں سزا دینی ہوگی۔ میں تم سے سخت ناراض ہوں۔'' نایاب رونے لگی اور امی سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی بھی کتابیں نہیں پھاڑے گی۔ میرا یقین کریں۔

نایاب نے پھر کبھی بھی کتاب نہیں پھاڑی۔ اسے اپنا فراک خود سینا پڑا اور اب جب بھی وہ امی کے ساتھ بیٹھ کر اپنی نظموں والی کتاب پڑھتی ہے تو ہمیشہ عورت اور جوتے والا صفحہ پلٹ دیتی ہے۔ اس کی حرکت سے مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوتی کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ آپ بھی جانتے ہیں کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔

خفتہ ملت کو جگا کر چل دیا
اپنی ہمت آزما کر چل دیا
بھولے افسانے شجاعت کے مرے
کون ہائے پھر سنا کر چل دیا
اک مسلسل رنج میں تھا غرق میں
کون مجھ کو گدگدا کر چل دیا
میری دُنیائے سیاہ روشن ہوئی
کون یہ شمع جلا کر چل دیا
چپکے چپکے روٹھ کر جانے کہاں
کون یہ آنکھیں چرا کر چل دیا
دُور اس دُنیا سے ساتھی بہت دُور
ہائے کوئی مسکرا کر چل دیا
میرے خوابوں کا حسیں محبوب آہ
ہاتھ ہاتھوں سے ملا کر چل دیا
ڈھونڈتا ہوں شرف صحرا میں اسے
جو مجھے بڑھ کر بلا کر چل دیا

نذیر احمد شرف سبوی

موسم بڑا سہانا تھا۔ بادلوں نے سورج کے سامنے پردہ کر رکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دوپہر میں ہی شام کا منظر لگ رہا تھا۔ دلاور ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی ابھی اس نے کھانا کھایا تھا۔ اس کی امی نے صبح ناشتے کے وقت ہی دلاور کا دوپہر کا کھانا پوٹلی میں باندھ دیا تھا۔ یہ دو پراٹھے تھے۔ ساتھ میں چٹنی تھی اور ایک پیاز تھا۔ دلاور کو اس کھانے نے بہت لطف دیا تھا۔ آخر ماں کے ہاتھ کا بنا کھانا تھا۔ اب دلاور کی آنکھوں میں خمار اتر آیا تھا۔ اسے میٹھی نیند اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ بند ہوتی آنکھوں سے اس نے سامنے دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر اس کی بصارت پر اندھیرے غالب آ گئے۔ درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے اسے سوتے ہوئے جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ اچانک وہ ہڑبڑا کر نیند سے جاگ پڑا۔ اسے اپنی ران میں درد کا احساس بھی ہوا تھا۔ کوئی تھا جو اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس آدمی نے دلاور کی ران پر اپنے پاؤں سے ٹھوکر ماری تھی۔

''کک...... کک کیا ہوا؟'' دلاور ابھی تک خمار سے باہر نہیں نکلا تھا۔

''اُٹھ او بکری باز...... وہ دیکھ تیری بکریاں میری فصل برباد کر رہی ہیں۔'' اس کے سر پر کھڑا آدمی غصے سے بولا۔ اب دلاور پھرتی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے حواس مکمل طور پر بیدار ہو چکے تھے۔ وہ برق رفتاری سے اپنی بکریوں کے ریوڑ کی طرف دوڑا۔

''ہیں...... ہیں...... ہوں...... ہوں۔'' وہ مخصوص آواز میں اپنی بکریوں کو بلا رہا تھا۔ جلد ہی اس کی بکریاں کھڑی فصل میں سے باہر نکل آئیں۔

''معافی باؤ جی...... معافی۔'' اب دلاور اس زمیندار کی منت سماجت کر رہا تھا۔

''سن او بکری باز...... تیرے باپ کی وجہ سے تجھے چھوڑ رہا ہوں مگر کام کوئی بھی ہو، کام ہوتا ہے۔ تو ذات کا چرواہا ہے تو اپنے فرض کا خیال رکھ۔ اپنی بکریوں کا خیال رکھ۔ جب اپنی بکریوں کو چرانے نکلا ہے تو ہوش میں رہ، ورنہ بکریوں کے ساتھ ساتھ تیرا بھی نقصان ہوسکتا ہے۔''

''جی باؤ جی...... میں خیال رکھوں گا۔'' دلاور نے سر جھکا لیا۔

''تیرا باپ کدھر ہے؟'' زمیندار نے پوچھا۔

''وہ تو مر گیا۔'' دلاور دکھ سے بولا۔

''اوہ...... تبھی میں کہوں...... بہت دکھ ہوا۔ اچھا آدمی تھا۔''

اس زمیندار کو حقیقی دکھ پہنچا تھا۔ دلاور چلنے لگا تو وہ زمیندار پیار سے بولا۔

''سن بیٹا...... کبھی سردی، گرمی، بارش میں اگر بکریوں کے لیے چارے کی ضرورت ہو تو آ کر لے جانا۔ تمہارا باپ بھی اخلاق والا تھا، تم بھی اخلاق والے ہو۔ کبھی بھی مشکل میں تمہاری مدد کر

کے مجھے خوشی ہوگی۔''

''جی باؤ جی...... اللہ آپ کو سلامت رکھے۔'' اب دلاور اپنی بکریوں کو آگے لگائے چل پڑا۔ اس کی غفلت کی وجہ سے اس کی بکریوں نے زمیندار کے کھیت سے اچھی طرح پیٹ بھر کر چارہ کھا لیا تھا۔ اب واپسی کا سفر شروع ہوا۔ دلاور سر جھکائے چل رہا تھا۔ باپ کا ذکر آیا تھا تو اسے اپنا ابو یاد آ گیا تھا۔ ابھی چار دن پہلے کی بات تھی، اس کا ابو بستر پر لیٹا زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کی امی آنسو بہا رہی تھی اور وہ اپنے ابو کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔

''سن بیٹا...... غور سے سن...... میری ساری زندگی بکریاں پالنے میں گزر گئی۔ اس کام سے نفرت مت کرنا۔ ہمارے نبی، پیغمبر بھی یہ کام کرتے رہے ہیں۔ اس کام میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص حکمت پوشیدہ ہے۔ یہ کام صبر کرنا سکھاتا ہے۔ اگر صبر کرنے کا سلیقہ اور قرینہ تمہیں آ گیا تو زندگی میں ہر کامیابی تمہارا مقدر ہوگی اور آخرت میں یہی صبر تمہاری نجات کا وسیلہ بنے گا۔ سن بیٹا...... سن۔'' بیٹا تو سن رہا تھا مگر ابو جی حکمت کی کوئی اور بات اسے سنانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان کی روح پرواز کر چکی تھی۔ بکریوں کی پرورش صبر کرنے کا سلیقہ کیسے سکھا سکتی ہے اور یہ صبر ہوتا کیا ہے۔ نبیوں اور پیغمبروں نے یہ کام کیوں کیا تھا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ باڑے میں موجود بکریاں مَیں...... مَیں کر رہی تھیں۔ شاید انہیں بھی خبر ہو چکی تھی کہ ان کا مالک رخصت ہو چکا ہے، مگر اس بات کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا کہ اب دلاور چاہتا یا نہ چاہتا، مگر اسے چرواہا بننا ہی پڑنا تھا۔ اس کام سے اس کے گھر والوں کی روزی روٹی وابستہ تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنے ابو اور بکریوں کے ہمراہ ویرانوں میں آتا تھا۔ تب بکریوں کو چرانے کا یہ عمل اس کے لیے بس کھیل تماشا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ کھیل تماشا اس کی ذمہ داری بن جائے گی۔ وہ بارہ سال کا لڑکا ہی تو تھا۔ ان ویرانوں سے اسے ڈر لگتا تھا۔ راستے اس کے دیکھے بھالے تھے مگر پھر بھی ایک عجیب سی دہشت اس کے اعصاب پر سوار رہتی تھی۔ ایسے میں اپنے ہمراہ بکریوں کا ساتھ اسے حوصلہ دیتا تھا۔ بکریاں اور ان کے بچے بہت شرارتی تھے اور ان سب سے بڑھ کر کالی تھا۔ کالی ایک پہاڑی نسل کا بکرا تھا۔ مضبوط اور شہ زور...... اس کے دس انچ لمبے سینگ کمان کی مانند مخالف سمتوں میں مڑے ہوئے تھے۔ وہ بکریوں کے اس قبیلے کا سردار تھا اور ان سب کا سردار دلاور تھا۔ چرواہا ہونا کس قدر مشکل کام ہے۔ اس بات کی دلاور کو اب سمجھ آ رہی تھی۔ کہاں انسان سے گھر کے چند افراد نہیں سنبھالے جاتے اور کہاں بکریوں کا ریوڑ سنبھالنا اور پھر سب کی سب خودسر اور شریر...... اب دلاور اسی کوشش میں لگا رہتا تھا کہ اس کی بکریوں کا ریوڑ کسی کی فصل میں گھسنے نہ پائے، مگر بکریوں کی کوشش ہوتی تھی کہ چلتے چلتے بیگانی فصل سے ایک آدھ لقمہ کھینچ ہی لیا جائے۔ دلاور کے پاس تین فٹ لمبا ڈنڈا تھا جس کی مدد سے وہ اپنی بکریوں کو ہانکتا تھا اور یہ مضبوط ڈنڈا کسی موذی جانور کو ڈرانے کے کام بھی آتا تھا۔ دلاور کو سب سے زیادہ کالی تنگ کرتا تھا۔ وہ ایک خودسر اور بے خوف بکرا تھا۔ سب سے آگے وہ چلتا تھا۔ اس کی قیادت میں بکریوں کا ریوڑ چلتا تھا اور سب سے پیچھے دلاور ہوتا تھا۔ چلتے چلتے جب کالی کنی کھاتا تھا تو تمام بکریاں بھی اس طرف ہو جاتی تھیں۔ اب دلاور کو اپنے مال کی حفاظت کے ساتھ ساتھ کھڑی فصلوں کو بھی بچانا ہوتا تھا۔ اسے کالی پر بہت غصہ آتا تھا۔ جب وہ کالی کو موڑنے کے لیے آگے بڑھتا تو کالی دلاور سے ہی الجھ پڑتا۔ اگلی دونوں ٹانگیں اٹھا کر وہ دلاور پر حملہ کرتا۔ دلاور بچہ ہی تو تھا۔ کالی کے سر کی ضرب سے وہ کتنی ہی بار گرا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے کالی سے خوف بھی آتا تھا مگر پھر غصہ خوف پر غالب آ جاتا تھا۔ ڈنڈے کی ایک ضرب نے کالی ہوا ہو جاتا اور بکریوں کی بھی دوڑیں لگ جاتیں مگر تھوڑی ہی دیر بعد صورت حال پھر سے پہلے جیسے ہو جاتی۔ دلاور کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اسے جنگ کے میدان میں پھینک دیا گیا ہو۔ ایک دن حالات سنگین صورت اختیار کر گئے۔ کالی حد سے زیادہ شوخی دکھا رہا تھا۔ دلاور اسے آوازیں دے دے کر تھک چکا تھا۔ ''ہیں...... ہیں...... ھر...... ھر...... ھرے۔'' مگر آج کالی کوئی فرمان ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ غصے کی شدت سے دلاور کا دماغ گھوم گیا۔ دلاور کے ہاتھ میں ڈنڈا موجود تھا۔ دلاور نے اسے موڑنے کی کوشش کی تو کالی اپنی اگلی ٹانگیں اُٹھائے دلاور پر چڑھ دوڑا۔ دلاور نے پوری قوت سے گھما کر ڈنڈا اس کی پچھلی ٹانگ پر دے مارا۔ کالی گر پڑا۔ پھر جب وہ اُٹھا تو لنگڑا رہا تھا۔ اب وہ تین ٹانگوں پر چل رہا تھا۔

''اسے کیا ہوا......؟'' دلاور نے سوچا۔ دوسری بکریاں اور بچے سہم گئے تھے۔ اس کے بعد کالی نے کوئی شرارت نہیں کی۔ جب اپنے ریوڑ کے ہمراہ دلاور گھر لوٹا تو امی پریشان ہوگئی۔

''کالی کو کیا ہوا؟'' امی نے پوچھا۔

''معلوم نہیں امی...... ابھی بابا جمعہ کو بلا کر لاتا ہوں۔'' دلاور

فوراً ہی گھر سے باہر نکل گیا۔ بابا جمعہ گاؤں کا سیانا حکیم تھا۔ انسانوں کے ساتھ ساتھ وہ جانوروں کا علاج بھی کرتا تھا۔ دلاور کے بلانے پر فوراً ہی گھر چلا آیا۔ کالی کی ٹانگ کا جائزہ لینے کے بعد وہ آہ بھر کر بولا۔

"ہوا کیا تھا؟"

"معلوم نہیں۔" دلاور مکر گیا تھا۔

"دیکھو بیٹا...... یہ مال مویشی بچوں جیسے ہوتے ہیں۔ بچوں کو اپنے نفع نقصان کا علم نہیں ہوتا۔ انہیں جس کام سے روکو، وہ وہی کام کرتے ہیں۔ یہاں صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ صبر بیٹا صبر...... کالی کی ٹانگ ٹوٹ چکی ہے۔ میں پٹی باندھ دیتا ہوں۔ روزانہ اس کی ٹانگ پر باسی پانی ڈالتے رہنا۔"

"جی بابا جی۔" دلاور رنجیدہ ہو گیا۔ اس کی وجہ سے کالی کو اس قدر تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسے اپنے ابو کی بات یاد آ گئی۔

"اس کام میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص حکمت پوشیدہ ہے۔ یہ کام صبر کرنا سکھاتا ہے۔ اگر صبر کرنے کا سلیقہ آ گیا تو زندگی میں ہر کام یابی تمہارا مقدر ہوگی۔"

جانے کیوں وہ سسک پڑا۔ اس نے بے صبری کا مظاہرہ کیا تھا اور ایک معصوم جانور کو تکلیف دی تھی۔ اس واقعہ کے بعد دلاور کا رویہ اپنے ریوڑ کے ساتھ بدل گیا۔ اب وہ جانوروں پر تشدد نہیں کرتا تھا۔ پیار سے ان کا رُخ موڑتا تھا۔ کالی ریوڑ کے ساتھ جاتا تھا مگر اب وہ تین ٹانگوں پر آہستہ آہستہ چلتا تھا اور اپنے انداز اور اطوار سے دلاور سے ناراض نظر آتا تھا۔

دلاور اسے پیار کرنے کی کوشش کرتا تو وہ دُور چلا جاتا۔ سر سہلانا چاہتا تو کالی سر جھٹک دیتا۔ جانوروں کی زبان نہیں ہوتی مگر احساسات ہوتے ہیں۔ دلاور کو کالی کی آنکھوں میں آنسو نظر آتے تھے۔ کون جانے کہ وہ تکلیف کی وجہ سے روتا تھا یا پھر اسے اپنا مالک یاد آتا تھا جو دلاور کا ابو تھا۔

اب دلاور اور کالی کے درمیان خاموش سی کش مکش چل رہی تھی۔ پھر تین ماہ گزر گئے۔ کالی کی ٹانگ کی ہڈی جڑ چکی تھی مگر اب وہ شوخی نہیں کرتا تھا۔ اس دن دلاور کی طبیعت خراب تھی۔ جانے کیوں چکر آ رہے تھے۔ اس نے بابا جمعہ سے دوا لی تھی مگر افاقہ نہیں ہوا تھا۔ صبح ہو چکی تھی اور بکریاں باڑے میں شور مچا رہی تھیں۔ ان کے بچے بھی بھوک سے بلبلا رہے تھے۔ چارہ تو گھر میں موجود نہیں تھا اور دلاور اپنے ریوڑ کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر وہ ہمت کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"رک جاؤ بیٹا...... میں چلی جاتی ہوں۔" امی بولی۔

"نہیں امی...... آپ گھر میں رہیں...... میں اب ٹھیک ہوں۔"

اس نے باڑے کا دروازہ کھولا۔ بکریاں اور ان کے بچے اُچھلتے کودتے باہر نکل آئے۔ دلاور نے ڈنڈا اُٹھا لیا اور پھر ڈنڈے کے سہارے ان کے پیچھے چل پڑا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے موجود منظر لرز رہا تھا مگر وہ چلا جا رہا تھا۔ ریوڑ گھاس پھوس پر منہ مارتا آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر اس زمیندار کا رقبہ شروع ہوا جس نے دلاور کو نیند سے جگایا تھا اور اسے مدد کی پیش کش کی تھی۔ اب فصل کٹ چکی تھی اور رقبہ خالی پڑا تھا۔ دلاور آرام کے لیے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے منظر دھندلا رہا تھا۔ بکریاں ادھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔ ایسے میں دلاور نے دیکھا کالی دلاور کی طرف

دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں وہ بہت غصے میں نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک ایک قدم اُٹھاتا ہوا دلاور کے قریب آ رہا تھا۔ آج دلاور میں اپنا دفاع کرنے کی سکت موجود نہیں تھی۔ کالی اب دلاور کے سر پہ پہنچ چکا تھا۔ پھر آن کی آن میں اس نے اپنی اگلی دونوں ٹانگیں اُٹھائیں اور حملہ کیا...... دلاور نے بچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی سمجھ کے مطابق کالی کو پورا حق تھا کہ وہ دلاور سے اپنی زیادتی کا انتقام لے۔ کالی نے اپنے اگلے کھروں کی ضرب پوری قوت سے لگائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ پھر سے اُچھلا تھا اور زور سے ضرب لگائی تھی۔ دلاور دیکھ رہا تھا۔ کالی کے حملے کا مرکز دلاور ہرگز نہیں تھا۔ پھر دلاور نے اپنے دائیں پہلو دیکھا۔ ساتھ ہی وہ لرز کر رہ گیا۔ بچہ ہی تو تھا۔ خوف کی شدت سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اُٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس لیے وہ لڑھک کر دُور چلا گیا۔ کالی اس وقت ایک زہریلے سانپ کے ساتھ جنگ لڑ رہا تھا۔ یہ سانپ دلاور کو ڈسنے ہی والا تھا کہ کالی نے حملہ کر دیا۔ پھر اپنے کھروں سے کالی نے سانپ کو کچل کر رکھ دیا۔ ایسے میں دلاور نے دیکھا۔ ایک آدمی اس کی طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔ یہ وہی زمیندار تھا۔ وہ چیخ کی آواز سن کر آیا تھا۔ پھر کالی کا کارنامہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا مگر دلاور کو نقاہت کی حالت میں دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے دلاور کو چھو کر دیکھا۔

''ارے...... تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔'' دلاور نے یہ آخری بات سنی تھی۔ پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔

اسے جب ہوش آیا تو وہ اپنے گھر میں موجود تھا۔ اس کی امی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ چیخ پڑا۔

''میری بکریاں...... میرا کالی۔''

''فکر مت کرو، وہ زمیندار جی بہت اچھے آدمی ہیں۔ ان کے ملازم تمہیں اور ریوڑ کو گھر چھوڑ گئے تھے اور ساتھ ہی چارہ بھی...... اور وہ کہہ گئے ہیں کہ جب تک تم صحت یاب نہیں ہو جاتے، چارہ ان کے ہاں سے آتا رہے گا۔'' امی خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاں! امی وہ بہت اچھے انسان ہیں...... میرا کالی کہاں ہے؟''

''باڑے میں اور کہاں ہوگا۔'' امی کو حیرت ہوئی تھی۔ دلاور اُٹھا اور باڑے میں آ گیا۔ کالی دلاور کے پاس چلا آیا اور پھر وہ ممنایا۔

''بھیں...... بھیں...... بھیں۔'' جیسے پوچھ رہا ہو کہ دلاور اب طبیعت کیسی ہے۔ دلاور کالی کے پاس ہی گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے بازوؤں کا ہار کالی کے گلے میں پہنا دیا۔ جانے کیوں آنسو دلاور کے رخساروں پر لڑھکنے لگے تھے۔

''شکریہ کالی۔''

''بھیں...... بھیں...... بھیں۔'' جیسے کالی کہہ رہا ہو۔

''کوئی بات نہیں مالک...... کوئی بات نہیں۔'' ☆☆☆

سچ کی برکت

یہ ان دنوں کی بات ہے جب قافلے پیدل چلا کرتے تھے۔ قافلے بے آب و گیاہ صحراؤں میں چشموں کے کنارے پڑاؤ ڈالتے اور کھانے پینے کی چیزیں تیار کر کے دوبارہ روانہ ہو جاتے۔ ایسا ہی ایک قافلہ بغداد جاتے ہوئے پڑاؤ میں تھا کہ ڈاکہ پڑ گیا۔ ڈاکو ایک ایک مسافر کی تلاشی لے رہے تھے اور ادنیٰ سے اعلیٰ ہر چیز ہتھیا رہے تھے۔ ان حالات میں تمام مسافر کچھ نہ کچھ چھپا لینے کی کوشش میں تھے، تاہم ایک لڑکا کانی کوڑی تک چھپانے کا روادار نہیں تھا۔ اس نے ڈاکوؤں کو بتا دیا تھا کہ اس کی قمیص کی تہہ میں چالیس اشرفیاں ہیں۔ یہ دیکھ کر ڈاکو لڑکے کو اپنے سردار کے پاس لے گئے۔

سردار ماجرا سن کر یوں مخاطب ہوا:

''تمہارے پاس کتنی اشرفیاں ہیں؟''

''چالیس۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

''ذرا دکھاؤ!'' سردار نے کہا۔ ''یہ رہیں! اماں نے میری قمیص کی تہہ میں سی دی تھیں۔''

(سردار نے بخیے ادھیڑ کر اشرفیاں گنیں۔)

''یہ تو چالیس ہیں۔'' ''تم نے چھپائی کیوں نہیں۔'' سردار نے پوچھا۔

''ماں نے کہا تھا کہ جھوٹ نہ بولنا۔'' لڑکے نے معصومیت سے جواب دیا۔

سردار ٹھٹکا۔ اسے خیال آیا کہ لڑکا نقصان کے اندیشے پر بھی ماں کا مطیع ہے جب کہ میں فائدے لے کر اپنے رب کا باغی بنا بیٹھا ہوں۔ اب کیا تھا! اس نے ڈاکوؤں کو بلا کر دل کی بات کہی اور آئندہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے توبہ کر لی۔ ڈاکوؤں نے دیکھا کہ مالک تائب ہو گیا ہے تو وہ بھی راہِ راست پر آ گئے۔ پس انہوں نے قافلے کو سامان لوٹایا اور کلمۂ حق کی آواز لگاتے ہوئے اپنے اپنے علاقوں میں پھیل گئے۔ واضح رہے کہ چالیس اشرفیوں والے بزرگ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تھے جو حصولِ علم کے لیے بغداد جا رہے تھے۔

(مریم منیر، چونیاں)

پیارے اللہ کے پیارے نام

راشد علی نواب شاہی
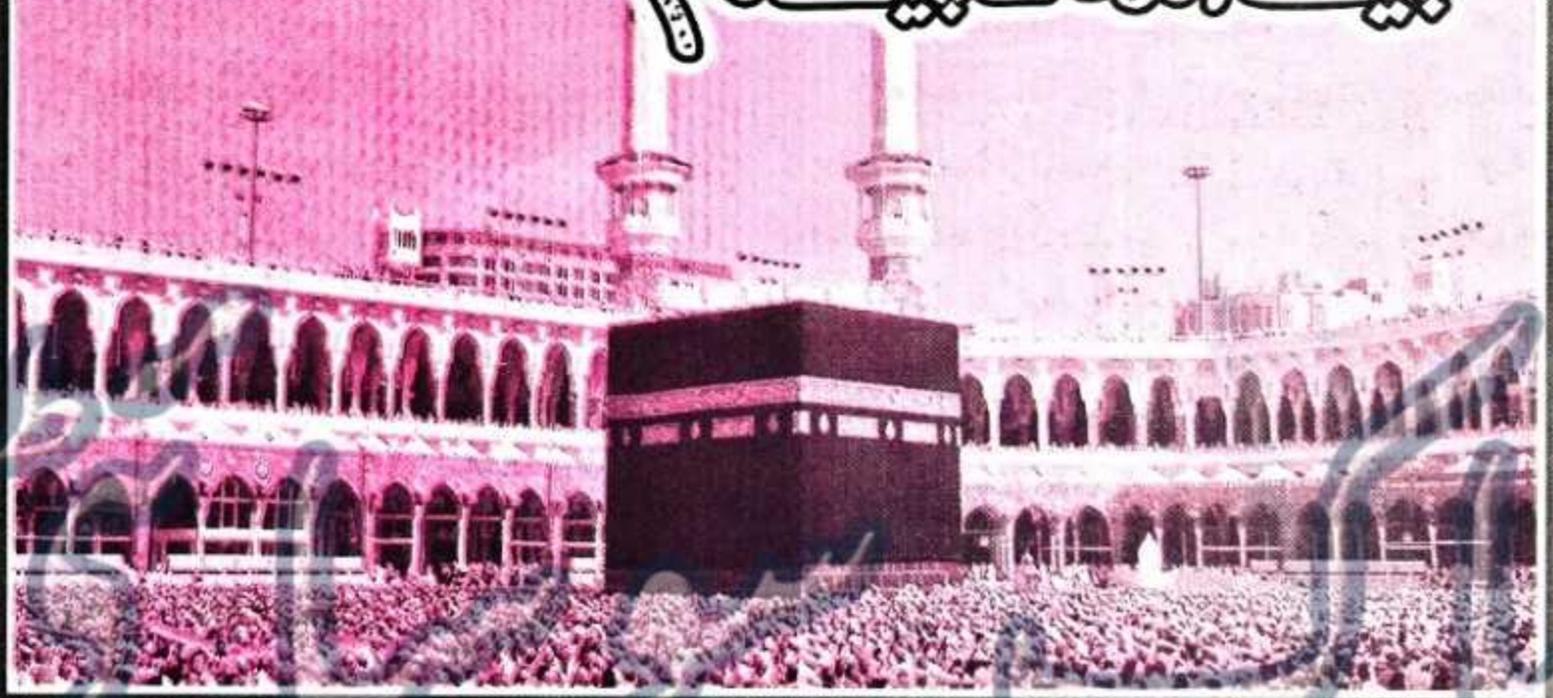
اَلْخَبِیْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ

(سب کی خبر رکھنے والا)

اَلْخَبِیْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ ہے جس سے کوئی پوشیدہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے اور جب بھی کوئی جان دار پریشان ہوتا ہے یا مطمئن، اس خبیر کو اس کی خبر ہوتی ہے۔

یہ مبارک نام قرآنِ کریم میں ۴۵ مرتبہ آیا ہے۔

عزیز ساتھیو! اَلْخَبِیْرُ کے معنی ہیں ہر ایک سے باخبر۔ کائنات کا کوئی ذرّہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم سے باہر نہیں ہے۔ جو خیال ہمارے ذہن میں آتا ہے یا جو کچھ ہم سوچتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہیں۔ آسمانوں، زمینوں میں، پہاڑوں کی چوٹیوں، سمندر کی تہوں میں اور ہزاروں پردوں کے پیچھے ایک چھوٹا سا دانہ ہو، اللہ تعالیٰ کو اس کا بھی علم ہے یا کالے پہاڑ پر کالی چیونٹی ہو تو اس کے چلنے سے بھی باخبر ہے۔

سنہری قلم

اقرا کے ماموں کراچی سے آئے تو اس کے لیے ایک سنہری قلم بھی لے کر آئے۔ قلم بہت خوب صورت تھا۔ اقرا کو بہت پسند آیا، جب کہ بلال کے لیے ایک گھڑی لائے تھے، مگر اسے بھی گھڑی سے زیادہ قلم پسند آیا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ یہ قلم مجھے مل جائے۔

"باجی! یہ قلم آپ مجھے دے دیں گی۔"

"نہیں، تمہارے لیے تو گھڑی آئی ہے۔"

"باجی! یہ قلم مجھے بہت اچھا لگا ہے۔"

"تو کیا ہر اچھی چیز دیکھ کر تم چاہو گے کہ وہ تمہیں مل جائے۔"

دونوں اسکول جاتے ہوئے یہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔

اقرا کو معلوم تھا کہ بلال پڑھنے لکھنے کا بہت شوقین ہے اور اچھے سے اچھے قلم جمع کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اسی بناء پر بلال جو کہ پانچویں جماعت کا طالب علم تھا، اس کی لکھائی پورے اسکول میں سب سے اچھی تھی۔ اگر اسے قلم دے دیا جاتا تو وہ اس کا حق ادا کر دیتا، مگر قلم، اقرا کو بھی بہت پسند تھا، وہ ہرگز اسے دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ اقرا تعلیمی کتابوں کے علاوہ رسائل بھی بڑے شوق سے پڑھتی تھی۔ اس نے گزشتہ سال نہم میں بورڈ کے امتحان میں اوّل پوزیشن بھی حاصل کی تھی۔ وہ بھی مطالعے کی بہت شوقین تھی، گویا

اس کا پسندیدہ مشغلہ پڑھنا ہی تھا۔ پڑھنا اور لکھنا دونوں بہن بھائی میں جمع تھا۔

اقرا نے رسالہ اُٹھایا اور پڑھنا شروع کیا، اچانک اس کی نظریں ایک واقعے پر جم گئیں:

''ایک صحابی روزہ پر روزہ رکھتے تھے۔ افطار کے لیے کوئی چیز میسر نہ آتی تھی تو انہوں نے آپؐ کے سامنے اپنے اس فقر کو بیان کیا، تو آپؐ نے صحابہؓ اجمعین سے فرمایا:

''کون ہے تم میں جو اپنے اس بھائی کی مہمان نوازی کا حق ادا کرے۔''

تو ایک صحابی حضرت ثابتؓ نے عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں ان کی مہمان نوازی کا حق ادا کروں گا۔'' پھر وہ ان کو اپنے ساتھ گھر لے آئے اور اپنی اہلیہ سے کہا:

''میں اللہ کے رسول (ﷺ) کے ایک مہمان کو لایا ہوں، چوں کہ کھانا کم ہے، تو تم چراغ کو درست کرنے کے بہانے بجھا دینا اور جب تک مہمان کا پیٹ نہ بھر جائے خود نہ کھانا۔'' چناں چہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ساتھ ایسے بیٹھے رہے جیسے کھا رہے ہوں، مگر کھایا نہیں۔ صبح حضرت ثابتؓ جب حضور ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوئے تو حضور ﷺ نے فرمایا:

''رات کا تمہارا اپنے مہمان کے ساتھ برتاؤ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند آیا۔'' کیوں کہ اس طرح کرنے پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی، جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اور ان کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے ان پر تنگ دستی کی حالت گزر رہی ہو۔''

اس خبیر ذات نے اپنے رسولؐ کو اس معاملے کی خبر کر دی تھی۔

یہ واقعہ پڑھتے ہی اسے محسوس ہوا کہ اس رسالے میں یہ واقعہ اسی کے لیے لکھا گیا ہے۔ سنہری قلم اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ ایک طرف اپنی چاہت اور دوسری طرف بھائی کی خواہش۔ اس کے دل اور دماغ میں ایک عجیب سی اُلجھن سی تھی۔ قلم اسے بے حد پسند آیا تھا۔ اس کی ساری سہیلیوں نے بھی اس قلم کی بہت تعریف کی تھی اور وہ اپنا قلم کسی قیمت پر بلال کو نہیں دینا چاہتی تھی۔

''اس خبیر کو تو خبر ہو گی جب میں اپنی خواہش کو بھائی کی خواہش پر قربان کر دوں گی۔ کیا معلوم یہی بات میری علمی ترقی کا ذریعہ بن جائے۔'' وہ اپنے آپ سے کہنے لگی۔

وہ ہمت کر کے اس خبیر کو راضی کرنے لگی جو ہر پوشیدہ بات کو جانتا ہے اور ہر اچھی بُری بات سے آگاہ ہے۔

اقرا کے ایثار کی وجہ سے قلم اس کے ہاتھوں سے بلال کے ہاتھوں تک کا سفر مکمل کر چکا تھا۔

یاد رکھنے کی باتیں

۱۔ اس مبارک نام سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اَلْخَبِیْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ کو سب کچھ معلوم ہے۔ ماضی میں جو ہوا، ابھی جو کچھ ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ ہوگا، ان سب باتوں کی خبر اس کے علاوہ کسی کو نہیں۔

۲۔ ہم جو کام کریں تو اس بات کا دھیان ہو کہ اس اَلْخَبِیْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ کو سب کاموں کی خبر ہے، اس لیے ہم ایسے کام کریں جو اس اَلْخَبِیْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ کو پسند ہیں۔

☆☆☆

قرض خواہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے زمانے میں ایک آدمی تھا، جس نے کبھی کوئی نیک کام نہ کیا تھا۔ وہ لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا۔ جب وصولی کے لیے آدمی بھیجتا تو اسے ہدایت کرتا کہ جو آسانی سے دے، اس سے لے لو اور جو تنگی میں ہو، اسے چھوڑ دو، بلکہ معاف کر دو۔ اس اُمید پر کہ اللہ ہم سے درگزر کرے۔ جب وہ فوت ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ کوئی نیک کام بھی کیا ہے؟ وہ بولا کہ کچھ نہیں، سوائے اس کے کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور خادم کو وصولی کے لیے بھیجتا تو یہ نصیحت کرتا کہ جو دے سکے اس سے لے لینا اور تنگ دست کو معاف کر دینا۔ ہو سکتا ہے، اللہ ہمیں بھی معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جاؤ میں نے تجھے معاف کیا۔ (بخاری، نسائی)

''آپ سب لوگ کل تیار رہنا ہم لوگ ایک نئی جگہ گھومنے جائیں گے۔'' کمال صاحب نے اعلانیہ انداز میں کہا۔

''مگر کہاں ابو؟'' عالیہ نے فوراً کتاب رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی تم اپنا ہوم ورک مکمل کرو، صبح خود ہی معلوم ہو جائے گا۔'' کمال صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''پھر بھی کوئی اشارہ تو دیں تاکہ ہمیں کچھ اندازہ ہو۔'' سعد نے بھی اصرار کرنا شروع کر دیا۔

''ہم ہر اتوار نئی جگہوں پر گھومنے جاتے ہیں نا، تو اس بار بھی میں نے ایک نئی جگہ کا انتخاب کیا ہے۔'' کمال صاحب نے جواب دیا۔

''ہاں مگر مزہ تو تب آئے جب ہم کسی ایسی جگہ جائیں جہاں بہت سی ویڈیو گیمز بھی ہوں، نہ کہ ہم کسی بوری پڑھنے لکھنے والی جگہ پر جائیں۔'' جواد نے ویڈیو گیم کھیلتے ہوئے کہا۔

''تمہارے پاس گھر میں ویڈیو گیمز کی کمی ہے کیا؟'' عالیہ نے کہا۔

''اتنی نہیں ہیں جتنی تمہارے پاس کتابیں ہیں، عالیہ میڈم!'' جواد نے جلدی سے جواب دیا۔

''اُف...... ایک تو تمہاری لڑائی! ہر وقت لڑتے رہتے ہو، کبھی تو چپ کر کے اپنا کام کیا کریں۔'' سعد نے جھنجلاہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''اچھا! اب تم لوگ آرام کرو، کل ہم سب گھومنے جائیں گے۔ تم لوگ صبح گیارہ بجے تک تیار رہنا، شب بخیر!'' کمال صاحب بچوں کو پُرجوش انداز میں کہتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔

☆

کمال صاحب اسلام آباد میں ایک سرکاری آفیسر تھے۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ان کے تین بچے تھے۔ وہ ان کی پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ وہ ان کو سکول کے کام کے علاوہ بھی ہر طرح کی اچھی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے لیے کہتے تھے۔ وہ ہر اتوار انہیں نئی جگہ گھمانے کے لیے لے جاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ الگ الگ کتابیں پڑھنے سے، لوگوں سے ملنے سے اور نئی جگہوں پر گھومنے سے انسان کی سوچنے کی قابلیت بڑھتی ہے اور اس کے کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔

☆

''جواد! جلدی آؤ، لیٹ ہو رہے ہیں ہم۔'' کمال صاحب نے ہارن بجاتے ہوئے کہا۔

''سوری! سوری! وہ ذرا آنکھ کھلنے میں دیر ہو گئی تھی۔'' جواد بھاگتا ہوا آیا اور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا اور گاڑی گیٹ سے باہر نکل پڑی۔

''بیٹا وقت پر کام کرنا سیکھو اور وقت کی قدر کیا کرو۔'' کمال صاحب نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''وہ دراصل ابو میں چاہتا تو ہوں، بس آنکھ نہیں کھلتی تو میں کیا کروں۔'' جواد نے سر کھجاتے ہوئے بولا۔

''بہانے......'' عالیہ نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا اور مسکرانے لگی۔

''بہانے نہیں کرتا اچھا۔ ابو یہ دیکھیں یہ اب مجھے چھیڑ رہی ہے۔'' جواد فوراً غصے میں بولا۔

''اچھا بھائی، اب تم لڑو نہیں۔'' کمال صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

اسی دوران انہوں نے گاڑی پارک کی اور بولے۔

''چلیں آپ لوگ اُتریں، ہم لوگ پہنچ گئے ہیں۔''

تینوں بچے جلدی سے دروازہ کھول کر اُتر گئے۔

وہ اِدھر اُدھر تجسس سے دیکھ رہے تھے کیوں کہ وہ ایک مارکیٹ میں کھڑے تھے۔

''ابو! یہ آپ کہاں لے آئے ہیں؟ یہاں پر تو ہم پہلے آئے ہوئے ہیں۔'' سعد نے کہا۔

''ہاں مگر یہاں پر ایک نئی جگہ بنی ہے، وہ سامنے دیکھیں!'' کمال صاحب نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''شہرِ کتاب!'' عالیہ نے خوشی سے بورڈ پڑھتے ہوئے کہا۔

''دیکھا، مجھے پتا تھا کہ ایسی ہی کوئی جگہ ہو گی۔'' جواد نے بوریت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''شہرِ کتاب کیا ہے ابو؟'' سعد نے جلدی سے پوچھا۔

''شہرِ کتاب کچھ دن پہلے ہی کھلا ہے۔ اس میں مختلف دُکانیں ہیں جہاں پر آپ کو ہر طرح کی کتابیں ملیں گی۔ یہاں پر غریب بچوں کے لیے بھی سستی کتابیں مہیا کی جاتی ہیں۔''

''واہ! کیا بات ہے، یہ تو بہت اچھی جگہ ہے۔'' عالیہ نے خوشی سے کہا اور وہ سب ''شہرِ کتاب میں داخل ہو گئے اور کتابیں دیکھنے لگ گئے۔

''جواد! تم کتابیں کیوں نہیں دیکھ رہے؟'' کمال صاحب نے پوچھا۔

''ابو! آپ کو پتا ہے، مجھے کتابیں نہیں پسند، میں بور ہو جاتا ہوں۔'' جواد نے جواب دیا۔

''کتاب بور تو نہیں کرتی بلکہ کتاب تو بہترین ساتھی ہے اور اچھی دوست ہوتی ہے۔'' کمال صاحب نے مسکراتے ہوئے سمجھایا۔

''کتاب اور دوست...... وہ کیسے؟'' جواد نے پوچھا۔

''اچھے دوست کی کیا نشانی ہے؟ یہی نہ کہ وہ مشکل کے وقت کام آئے۔ وہ ہمیں کام یاب کرنے میں ہماری مدد کرے۔ جب بھی ہمیں کچھ سیکھنا ہو، وہ اس میں ہماری مدد کرے اور ہمیں راستہ دکھائے۔'' کمال صاحب نے پوچھا۔

''جی بالکل۔'' جواد نے جواب دیا۔

''تو کتاب بھی ہر مشکل میں ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ جب آپ اچھی اچھی کتابیں پڑھتے ہیں تو آپ کو بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے اور ہمیں الگ الگ راستے دکھاتی ہے تاکہ ہم ان پر چل کر نہ صرف اپنی مشکل کا حل تلاش کر سکیں بلکہ کام یاب بھی ہوں۔'' کمال صاحب نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہے۔ میں نے پہلے نہیں سوچا تھا۔'' جواد نے سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں کہا۔

''ابو! کیا کتابیں اچھی یا بُری بھی ہوتی ہیں؟ جیسا کہ آپ نے کہا کہ جب ہم اچھی اچھی کتابیں پڑھیں تو کام یاب ہوتے ہیں۔''

سعد نے پوچھا۔

کمال صاحب، سعد کا یہ سوال سن کر مسکرا کر بولے۔

''نہیں بیٹا! سب کتابیں اچھی ہوتی ہیں، مگر ہم سب کی ضرورت الگ الگ ہوتی ہے جس کی وجہ سے میں نے کہا کہ اگر ہم کوئی ایسی کتاب پڑھتے ہیں جو ہماری ضرورت کے حساب سے اچھی ہے تو کتاب کبھی بھی بُری نہیں ہوتی۔ ہر کتاب میں کچھ نہ کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔''

''ابو! میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ کتاب ہمیں ماضی اور مستقبل دونوں میں لے جاسکتی ہے، کیا ایسا ہوتا ہے؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''جی ہاں! بالکل ایسا ہوتا ہے۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ ایسا تو گیمز یا فلموں میں ہوتا ہے مگر کتابوں میں نہیں۔'' جواد نے فوراً سے کہا۔

''میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ مثال کے طور پر آپ ایک ایسی کتاب پڑھتے ہیں جس میں قائداعظم کے زندگی کے بارے میں لکھا ہے یا کسی بھی کام یاب آدمی کی زندگی کے بارے میں لکھا ہے تو جب وہ کتاب پڑھتے ہیں تو اصل میں آپ کو لگتا ہے کہ آپ ماضی میں چلے گئے ہیں اور وہاں جا کر اُن کی زندگی کو اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ اُس کے برعکس جب آپ کوئی ایسی کتاب پڑھتے ہیں جس میں آپ کو بتایا گیا ہو کہ آپ بہت کچھ کرسکتے ہیں تو آپ کا دماغ مستقبل میں جا کر سوچنے لگ جاتا ہے۔ جہاں تک بات فلموں اور گیمز کی ہے تو اُن کی مثال ایک خوب صورت گھر کی سی ہے مگر کتاب کی مثال ایک بنیاد کی سی ہے۔ گھر جتنا بھی اچھا ہو اُس کا دارومدار اس کی بنیاد پر ہے۔'' کمال صاحب نے تفصیلاً سمجھایا۔

جواد اب گہری سوچ میں ڈوب چکا تھا اور اُس کو کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہونے لگا تھا۔

''اچھا! اگر میں کہوں کہ آپ لوگ کھانا نہ کھائیں تو کیا آپ لوگ زندہ رہ پائیں گے؟'' کمال صاحب نے پوچھا۔

''بالکل بھی نہیں کیونکہ اس سے تو ہمارا جسم کمزور پڑ جائے گا اور اس پر بہت سی بیماریاں حملہ کریں گی۔'' سعد نے جھٹ سے جواب دیا۔

''جی ہاں! بالکل اسی طرح جس طرح کھانا جسم کے لیے ضروری ہے، کتاب دماغ کی غذا ہے۔ جب آپ کتاب نہیں پڑھتے تو اس پر طرح طرح کی بیماریاں جیسے بوریت، کم عقلی، غصہ، حسد، بغض حملہ کرتے ہیں، مگر جب ہم کتاب پڑھتے ہیں تو اپنے دماغ کو بُرے خیالات سے بچا لیتے ہیں۔ ہمارا دماغ سمجھ داری سے زندگی گزارنے کے قابل ہو جاتا ہے اور بُرائی کا شکار نہیں ہوتا۔'' کمال صاحب نے تفصیلاً بتایا۔

''دیکھو بچو! جب ہم ہر مہینے کم سے کم دو کتابیں پڑھتے ہیں تو سال میں کتنی ہوئیں؟ کمال صاحب نے پوچھا۔

''چوبیس۔'' عالیہ نے فوراً جواب دیا۔

''اور اگر ہم دس سال تک ہر سال چوبیس کتابیں پڑھتے رہیں تو کتنی ہوں گی؟'' کمال صاحب نے پوچھا۔

''دو سو چالیس۔'' سعد نے جواب دیا۔

''بالکل! دیکھو بچو، جو شخص دو سو چالیس کتابیں پڑھ چکا ہوتا ہے، اس کے پاس بہت سی معلومات ہوتی ہیں جس کی مدد سے وہ اپنی سوچنے کی صلاحیت میں اضافہ کر لیتا ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے پہلے کے لوگوں نے کیا غلطیاں کی تھیں، وہ ان غلطیوں سے بچ جاتا ہے اور جو اچھے کام کر کے وہ کام یاب ہوئے ہوتے ہیں، وہ کر لیتا ہے۔ ہر کام یاب آدمی کتاب پڑھنے والا ہوتا ہے۔ وہ کم سے کم دو کتابیں ہر مہینے ضرور پڑھتا ہے اور اس کے گھر میں اپنی لائبریری بھی ہوتی ہے۔ لائبریری گھر میں ایسے ہی ہے جیسے جسم میں روح۔ آج کے بعد آپ سب بھی ہر مہینے دو کتابیں اپنی جیب خرچ سے لیں گے اور اس کو پڑھیں گے تاکہ آپ کو نہ صرف اچھی کتابیں خریدنے کی عادت پڑے بلکہ آپ لوگوں کی اپنی لائبریری بھی بنے۔'' کمال صاحب نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں تین کتابیں لوں گا۔'' جواد نے کہا۔

سب اس کی طرف حیرانگی سے دیکھنے لگے۔

''دو کتابیں اپنے لیے اور ایک کتاب کسی غریب بچے کو دینے کے لیے تاکہ وہ بھی علم حاصل کر سکے۔'' جواد نے پُرجوش ہو کر کہا۔

''ہم بھی ایک ایک کتاب تحفہ دیں گے۔'' سعد اور عالیہ نے آگے بڑھ کر جواد کو خوشی خوشی گلے لگا لیا۔

کمال صاحب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ پھر تمام بچوں نے اچھی اچھی کتابیں خریدیں اور ہنسی خوشی گھر کی طرف چل پڑے۔

☆......☆......☆

پیارے بچو! آپ میں سے کون کون ہر مہینے دو کتابیں پڑھے گا؟ اپنی لائبریری بنائے گا؟ اور ایک کتاب تحفہ دے گا؟

ہمیں خط لکھ کر اپنے عہد کے بارے میں ضرور بتائیں۔ ☆

بوجھو تو جانیں

نھنے قارئین

1- دیکھو ایک پتے کا کمال
ڈالو سبز نکالو لال

2- بے شک ہو نہ ہاتھ میں ہاتھ
چلتا ہے وہ آپ کے ساتھ

3- سب سے تیز اس کی رفتار
ذہن میں آئے وہ سو سو بار

4- پھولا پھولا اس کا پیٹ
رہے بستر پر وہ لیٹ

5- شیشے کا ہے اک مکان
اندر ہے لوہے کا مکان

(مقدس چوہدری، راول پنڈی)

6- پہاڑ کے اندر ایک پہاڑ
اس کے اندر ایک غار
جو کچھ اس کے اندر جائے
دھول بن کر واپس آئے

(فاطمہ نور، شیخوپورہ)

7- ایک قلعے میں نو دس پریاں
آپس میں سر جوڑے کھڑیاں

(مومنہ عامر، لاہور)

8- آندھی ہو یا تیز ہوا
کبھی بجھنے نہ پائے ایک دیا

(سارا ارشد، سرگودھا)

9- ایک گز کا طول، کبھی کلی کبھی پھول

(محمد مصحف الحسن، ڈیرہ اسماعیل خان)

جوابات: 1- پان 2- سایہ 3- خیال 4- تکیہ 5- بلب 6- چکی 7- مالٹا 8- چاند 9- چھتری

اس تصویر میں دس کھلونے اور دو کتابیں چھپی ہیں۔ آپ انہیں تلاش کر سکتے ہیں؟ ہر چیز پر نشان لگایئے اور پھر الگ کاغذ پر ایک ایک کا نام لکھیے۔

حضرت شعیب علیہ السلام
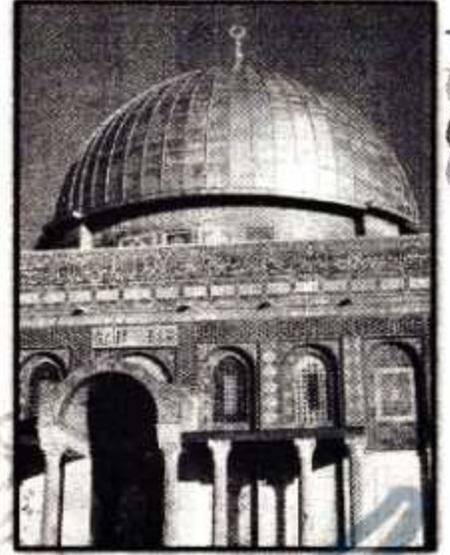
جب حضرت یوسفؑ کے والدین اور بھائی مصر میں آ گئے تو عزیزِ مصر نے کہا۔ ''تمہیں اختیار ہے جہاں چاہو انہیں آباد کرو۔'' حضرت یوسفؑ نے یہی مناسب سمجھا کہ انہیں شہروں میں آباد نہ کیا جائے کیوں کہ شہری ماحول اکثر اچھا نہیں ہوتا۔ چناں چہ آپؑ نے اپنے بھائیوں کو ایک سرسبز علاقے میں آباد کر دیا۔ انہی میں سے حضرت شعیبؑ اللہ کے پیغمبر ہو کر دُنیا میں تشریف لائے۔ لوگ ایک خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ خرید و فروخت میں پورا لینا اور کم تولنا ان کا عام پیشہ تھا۔ چوریاں کرتے اور ڈاکے ڈالتے۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ہر ممکن طریقے سے دولت جمع کی جائے۔ اس کے علاوہ وہ اچھے زمیندار بھی تھے اور زرعی پیداوار سے انہیں معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ اس چیز نے انہیں مغرور اور متکبر بنا رکھا تھا۔ آپؑ نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ خدائے واحد کی پرستش کرو۔ اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ خرید و فروخت میں ناپ تول کو پورا رکھو اور لوگوں کے ساتھ معاملات کرتے وقت کھوٹ نہ ملایا کرو۔ اگر تم اپنی کامرانی اور کامیابی کے خواہش مند ہو تو ان بُرے کاموں سے باز آؤ اور خدا کے دین کا راستہ اختیار کرو اور زمین پر فتنہ و فساد نہ پھیلاؤ۔ میں تم کو آگاہ کرتا ہوں کہ جن لوگوں نے دُنیا میں فتنہ و فساد پھیلایا اور خدا کا راستہ چھوڑ کر شیطان کی پیروی کی، ان کا انجام اچھا نہیں ہوا۔ حضرت شعیبؑ بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ آپؑ نے ہر طریق سے قوم کو سمجھانے کی کوشش کی۔ محبت سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ خدا کے عذاب سے ڈرایا مگر ان لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ انہوں نے حضرت شعیبؑ کی مخالفت شروع کر دی۔ چند ایک غریب اور کمزور لوگ جو حضرت شعیبؑ پر ایمان لے آئے تھے، ان سرکشوں نے ان کو ستانا شروع کر دیا۔ راستوں میں بیٹھ کر ان کو لوٹ لیتے، زدوکوب کرتے اور دھمکاتے لیکن اس کے باوجود حضرت شعیبؑ خدا کی طرف سے جو پیغام لے کر آئے تھے لوگوں کو سناتے رہے۔ اس پر اس قوم کے سردار حضرت شعیبؑ کے پاس آئے اور آپؑ کو دھمکی دی کہ اگر تم اپنے اس وعظ و نصیحت سے باز نہ آئے تو ہم مجبور ہوں گے کہ آپؑ کو یہاں سے نکال دیں۔ حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔ ''میں جو کچھ کہتا ہوں، تمہاری ہی بھلائی اور بہتری کے لیے کہتا ہوں اور پھر میں جو تم کو یہ بھلائی کی باتیں سناتا ہوں۔ تم سے ان کا معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ میرا بدلہ تو میرے اللہ کے پاس ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر تم نے میرا کہنا نہ مانا تو تم پر خدا کا عذاب نہ نازل ہو جائے۔'' قوم کے سردار غصہ میں آ کر بولے۔ ''اے شعیب! کیا تیری نماز ہم سے یہ چاہتی ہے کہ اپنے دیوتاؤں کی پوجا چھوڑ دیں، جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں اور ہم اگر کم تولنا چھوڑ دیں، کاروبار میں کھوٹ نہ کریں تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم مفلس و قلاش ہو جائیں۔'' سرداروں نے کہا کہ اے شعیبؑ ہماری سمجھ میں تو تمہاری باتیں نہیں آتیں اگر تو واقعی سچا ہے تو چاہیے تھا کہ تمہاری حالت ہم سے بہتر ہوتی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ تو بہت کمزور اور غریب ہے۔ ہم تو اس لیے تیرا لحاظ کرتے ہیں کہ تو ہماری قوم میں ہی سے ہے۔ ورنہ تجھ کو سنگسار کر دیتے۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''اگر تم نہیں مانتے تو تم جانو اور تمہارا کام میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ عنقریب خدا کا عذاب اس کا فیصلہ کر دے گا کہ ہم میں سے کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ میں بھی انتظار کرتا ہوں اور تم بھی انتظار کرو۔'' آخر جب قوم کی نافرمانی حد سے بڑھ گئی اور انہوں نے حضرت شعیبؑ کے خدائی پیغام کو ٹھکرا دیا تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا اور حضرت شعیبؑ کی قوم پر خدا کا عذاب نازل ہو گیا۔ صرف حضرت شعیبؑ اور ان کے چند ایک ساتھی اس عذاب سے بچے، جنہوں نے ہمیشہ اللہ کے عذاب سے پناہ مانگی تھی۔ کہتے ہیں مدین کی تباہی و بربادی کے بعد حضرت شعیبؑ حضرموت کے شہر سیلون کے قریب آ کر ٹھہرے اور وہیں آپؑ نے وفات پائی۔

کھوج لگائیے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 ستمبر 2016ء ہے۔

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 ستمبر 2016ء ہے۔

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

ستمبر کا موضوع ''گائے کی قربانی'' ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 ستمبر 2016ء ہے۔

نام ____________ عمر ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________

آ	ی	م	ا	ن	ء	غ	ڑ	چ	پ
ذ	ت	ے	س	ہ	ژ	ط	ف	ع	س
ش	گ	خ	ن	ا	و	ض	ر	ش	ا
ی	ع	ل	ر	ق	ب	ن	ع	م	ق
ز	م	ٹ	ا	ع	ج	ا	ز	ا	ب
ہ	و	ئ	ر	ا	ح	ی	ل	ن	ا
ی	ث	ع	ح	س	ق	ی	ر	ش	ل
ط	ل	م	ض	د	ی	ج	م	ٹ	ص
ا	ک	د	خ	ط	ا	ر	ق	ظ	غ
ر	م	ت	ع	ژ	ح	ب	ی	ب	ڈ

آپ نے حروف ملا کر دس بچوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

مجید، حبیب، کلثوم، اقبال، ایمان، راحیل، شیزہ، رضوان، عثمان، اعجاز

قندِ مکرر

وہ ایک سفر

6 ستمبر 1965ء کا آنکھوں دیکھا حال
لمحہ بہ لمحہ رُوداد

نیاز علی بھٹی

اس سفر کا آغاز میرے گاؤں سے ہوتا ہے۔ آیئے پہلے میں آپ کو اپنے گاؤں لے چلوں۔ یہ ہے میرا گاؤں ''دھیر کے''۔ یہاں سے بھارت کتنی دُور ہے، آپ اس کا اندازہ بھارت کے اس گاؤں کو جس کا نام ''داؤ کے'' ہے، دیکھ کر لگا سکتے ہیں۔ ان دونوں گاؤں کے درمیان کھیت ہیں یا سرحد کی برجیاں۔ میں 6 ستمبر 1965ء کو اسی گاؤں میں تھا اور بھارتی توپوں کی گھن گرج سن رہا تھا۔ یوں تو بندوقوں کی ٹھائیں ٹھائیں اور توپ کی گھن گرج سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے کیوں کہ یہ آوازیں تو ان کی زندگی کا ایک حصہ ہیں لیکن 6 ستمبر 1965ء کے دن یہ گھن گرج کسی اور انداز میں آئی۔

مجھے یاد ہے، اس دن مجھے لاہور جانا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پنجاب یونی ورسٹی میں داخلہ لوں۔ 6 ستمبر 1965ء شاید داخلے کا آخری دن تھا، لہٰذا میں نے صبح سویرے ہی اپنے گاؤں کو چھوڑا۔ پنجاب یونی ورسٹی میرے گاؤں سے اندازاً پندرہ میل کے قریب ہے جس کے لیے مجھے برکی اڈہ سے جو میرے گاؤں سے تقریباً تین میل دُور ہے، بس پکڑنی تھی۔

میں اپنے گاؤں سے دو میل ہی دُور گیا ہوں گا کہ میرے سر کے اوپر سے چند جہاز چیختے چنگھاڑتے گزرے۔ اس اچانک شور کے لیے میں بالکل تیار نہ تھا۔ میں فوراً زمین پر لیٹ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آسمان مجھ پر گر پڑا ہے۔ جہاز کی آواز اس قدر نزدیک اور زور دار تھی کہ زمین دہل گئی۔ اس غیر متوقع واقعہ نے مجھے ششدر کر دیا اور میں اس کشمکش و پنج میں تھا کہ کیا کروں، آیا لاہور جاؤں یا واپس اپنے گاؤں۔ میں دم سادھے زمین پر پڑا تھا کہ محسوس ہوا کہ آواز کم ہو گئی ہے۔ جان میں جان آئی۔ اُٹھا، کپڑے جھاڑے اور لگا جہازوں کو گننے، جو بہت مشکل تھا۔ جہاز میرے لیے کوئی نئی چیز نہ تھے مگر صبح سویرے حد بندی لائن پر جہازوں کا پرواز کرنا اچنبھے والی بات ضرور تھی۔ خیال آیا کہ شاید مشق کر رہے ہوں اور پھر میں اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔

ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ کھیت میں چھپا ہوا ایک زمین دار بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور ہانپتا کانپتا پوچھنے لگا۔

''کی کوئی جاز ڈگ پیا اے؟'' (کیا کوئی جہاز گرا ہے؟)

''نہیں فکر نہ کرو، جہاز مشق کر رہے ہیں۔'' میں نے اس کو تسلی دینے کی کوشش کی مگر وہ میرے جواب سے مطمئن نظر نہ آتا تھا۔

میں اس واقعے کو بھلا کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گیا۔ راستے میں ایک گاؤں پڑتا ہے جس کا نام ہے برکا، وہاں پہنچا۔ زندگی اپنے معمول پر تھی۔ وہی دیہاتی لوگ تھے اور وہی ان

کے معمولات۔ کوئی مسواک کر رہا تھا، کوئی سر پر چارہ اُٹھائے آ رہا تھا۔ کچھ لوگ کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے۔ گاؤں کے کنوئیں پر ماشکی پانی بھر رہا تھا۔ مجھے وہاں کسی قسم کی تبدیلی نظر نہ آئی مگر ایک چیز ضرور میں نے دیکھی کہ کبھی کبھی لوگ آسمان کی طرف سر اُٹھا کر دیکھتے تھے اور پھر کوئی چیز نہ پا کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ وہاں سے میں برکی گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ سورج مشرق سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ راستے میں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ آج لوگ سورج کی کرنوں سے بے پروا ہیں کیوں کہ پہلے کی نسبت برکی کو جانے والے راستے پر چہل پہل کم تھی، ورنہ یہ راستہ تو گوالوں سے بھرا ہوتا تھا۔ میں برکی کی طرف تیز رفتاری سے چلنے لگا کیوں کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں پہلی بس چھوٹ نہ جائے۔

برکی پہنچا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ آج اس گاؤں میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ اپنے اپنے گھروں میں چلے جائیں۔ میں نے دیکھا کہ آج گاؤں میں کچھ بے اطمینانی سی تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ لوگ اپنے معمولات بھول جائیں۔ جامع مسجد میں نہانے والوں کا، جو عموماً نمازیوں سے زیادہ ہوتے ہیں، وہی جمگھٹا تھا اور حلوائی کی دُکان پر دہی کی لسی کے دو دو منزلہ گلاس چل رہے تھے۔

میں گاؤں میں سے گزر کر بس کے اڈے کی طرف گیا۔ یہ گاؤں سے باہر ''لاہور برکی روڈ'' (موجودہ غازی روڈ) پر پولیس تھانے کے پاس ہے لیکن افسوس! پہلی بس نکل گئی۔ وہ مجھ سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ میں نے بہت شور مچایا اور ہاتھ ہلائے مگر ڈرائیور نکل گیا۔

اب اڈے پر میں اکیلا مسافر تھا۔ آج یہاں کچھ رونق بھی نہ تھی، حالانکہ یہ اڈا گوالوں کی آرام گاہ کہلاتا ہے۔ سارا دن اور رات لاہور آنے جانے والے گوالے یہاں موجود ہوتے تھے اور لین دین کرتے تھے مگر آج یہاں سوائے میرے اور دو ایک دُکان داروں کے کوئی موجود نہ تھا۔ میں سوچنے لگا کہ شاید جلدی آ گیا ہوں مگر اب تو سورج بھی نکل آیا تھا۔ دل و دماغ نے گواہی دی کہ آج دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ ایک دُکان دار سے دوسری بس کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا۔ ''جب خدا کو منظور!''

اس سے گپ لگانے کی کوشش کی مگر میں نے محسوس کیا کہ آج وہ گپ شپ کے موڈ میں نہ تھا۔

اتنے میں ایک فوجی جیپ آئی اور میرے سامنے آ کر رکی۔ ایک فوجی افسر اُترا اور کہنے لگا کہ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں اور سڑک بالکل صاف کر دیں۔ میں نے سوچا کہ شاید آج یہاں ہمارے فوجی کسی مشق پر آ رہے ہیں اور یقیناً پیچھے کوئی کانوائے آ رہا ہے۔ اتنی دیر میں تھانے سے ایک سپاہی آیا اور مجھے بھی گھر جانے کے لیے کہا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ آج کیا ہو رہا ہے تو اس نے کہا کہ پتا نہیں، ہڈیارہ پل کے پرے سے کوئی جواب یا آدمی نہیں آ رہا۔

میں نے صبح سے اب تک کے حالات کا جائزہ لیا، لہٰذا فوراً برکی گاؤں کو پلٹ آیا مگر میں نے دیکھا کہ چند منٹ پہلے کے برکی اور اب میں بہت فرق تھا۔ چند ایک واقف کاروں سے وجہ پوچھی تو انہوں نے آسمان کی طرف انگلی اُٹھائی۔ اب میں نے غور سے دیکھا تو نیلے آسمان کے بجائے سفید دھواں نظر آیا۔ یہ گولوں کا دھواں تھا۔ دوسرے ہی لمحے یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ گولے کہاں سے آ رہے ہیں اور کیوں آ رہے ہیں۔ توپ چلنے کی آواز صاف آ رہی تھی۔

برکی گاؤں میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہڈیارہ پر بھارتی فوج نے قبضہ کر لیا ہے۔ ''نہیں! یہ کیسے ممکن ہے، یقیناً کسی دشمن نے افواہ اُڑائی ہے۔'' میں نے سوچا مگر دل نے کہا کہ دشمن سے کچھ بھی بعید نہیں۔ میں سوچنے لگا کہ اگر بھارت کے حملے والی بات درست ہے تو اب تک بھارتی فوج میرے گاؤں پر بھی قبضہ کر چکی ہو گی کیوں کہ جس رفتار سے گولوں کی آواز بڑھ رہی تھی یہ بعید نہ تھا۔ پھر جب یہ خیال گزرا کہ میرے بوڑھے والدین، بیوی بچے اور بہن بھائی بھارت کی قید میں ہوں گے، بھارتی درندے ان پر ظلم کر رہے ہوں گے، تو دل نے کہا۔ ''اب عمل کا وقت آن پہنچا ہے۔'' مگر حالات کے ہاتھوں میں اتنا مجبور تھا کہ کوئی راہ نہ سوجھی۔ دماغ کہہ رہا تھا کہ گاؤں واپس نہ جانا، باقی گھر والے تو بھارت کے ہاتھوں میں گئے، تم کیوں جان گنواتے ہو؟ یہیں آنے والے وقت کا انتظار کرو۔ دل نے کہا یہ ضروری نہیں، ہو سکتا ہے کہ ابھی تک والدین بچے اور بہن بھائی تمہارے انتظار میں صحیح سلامت ہوں۔ ماں باپ نے تمہیں پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ کیا اس لیے کہ آج مصیبت کے وقت تم ان کو بھارتیوں کے ظلم تلے پسنے دو اور خود اپنی جان بچاتے پھرو۔ ہمت نہ ہارو، اللہ کا نام لے کر چل پڑو۔ تمہاری ایک جان ان کی عزت اور جان کے مقابلے میں خاک بھی نہیں۔''

میں دوسرے ہی لمحے میں اسی پگڈنڈی پر جس سے ابھی کچھ منٹ پہلے گزرا تھا، واپس گاؤں کی طرف سرپٹ بھاگ رہا تھا۔

دوڑتا بھاگتا جب میں برکا گاؤں پہنچا تو گاؤں سے باہر مجاہد فورس کے چند جوان ملے۔ ان کی وردیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ بندوقوں پر گیلی مٹی جمی ہوئی تھی، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ جوان ہڈیارہ نالہ عبور کر کے آ رہے ہیں۔ ان کے چہروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ خدا جانے ان بے چاروں پر رات کے اندھیرے میں کیا گزری۔ ان کو دیکھ کر میں ذرا رُکا اور ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ ایک کو میں نے پکڑ کر بٹھایا تو وہ ہکلاتے ہوئے صرف یہ کہہ سکا۔ ''بھارتی...... فوج...... ہڈیارہ...... قبضہ......'' اس کے یہ چار الفاظ میرے لیے کافی تھے اور میں ڈبل رفتار سے دوڑ پڑا۔ برکا گاؤں پہنچا تو وہاں کے حالات بھی تبدیل شدہ پائے۔ لوگ اپنے گھروں کی چھتوں پر کھڑے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ گاؤں سے باہر مجھے کوئی شخص نہ ملا بلکہ مجھے بھاگتا ہوا دیکھ کر لوگ اور بھی متفکر ہوئے۔ ایک بزرگ نے جو کہ شاید مجھے جانتے تھے، چھت ہی سے تسلی دی۔ ''بیٹا! فکر نہ کرو، ہمت سے کام لو۔'' ان حالات میں بزرگ کے یہ الفاظ میرے لیے بڑے حوصلہ افزا تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر جواب دیا، کیوں کہ میری سانس پھولی ہوئی تھی۔

برکا گاؤں سے اب میں اپنے گاؤں والے راستے پر دوڑ رہا تھا۔ راستے میں میں نے جو ذرا ہڈیارہ کی طرف نظر اُٹھائی تو میری رہی سہی ہمت بھی جاتی رہی کیوں کہ دُور سے انسانی سر نظر آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں یہ سمجھا کہ بھارتی فوج ہڈیارہ نالہ عبور کر کے برکی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں نے سوچا، خدانخواستہ اگر یہ بھارتی برکی پہنچ گئے اور بی آر بی نہر پر قبضہ کر لیا تو پھر یہ لاہور کی طرف پیش قدمی کریں گے اور اگر یہ بدقسمتی ہوئی تو ہم یہاں مارے جائیں گے اور خدا جانے لاہور پر کیا آفت آئے مگر ان خدشات کے باوجود دل کو یقین تھا کہ لاہور زندہ رہے گا۔ میں نے پوری ہمت کی اور پوری قوت سے بھاگنا شروع کیا مگر قدم آگے رکھتا تھا اور پڑتا پیچھے کی طرف تھا۔ بھارتی فوج اب سایوں میں بدل چکی تھی اور میری طرف بڑھ رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ان سایوں نے ایک قافلہ کی شکل اختیار کر لی۔ یہ ایسا قافلہ تھا جو رات کے اندھیرے میں راہزن کے ہاتھوں لٹ گیا تھا۔ یہ مرد و زن کا بھاگتا ہوا ایک ریلا تھا۔ لٹے پٹے پاکستانیوں کا قافلہ تھا۔

قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ ہڈیارہ کے رہنے والے لوگ تھے جو بھارتی فوج کے ہاتھوں اپنی عزت و جان بچا کر وہاں سے نکلے تھے۔ راستے کے سفر نے ان لوگوں کی حالت خستہ کر دی تھی۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ بچے خوف سے رو رہے تھے۔ عجیب بات تھی کہ آج وہ پاکستان میں ہوتے ہوئے بھی دوبارہ مہاجر بن

گئے تھے لیکن ان ساری باتوں کے باوجود ان کے چہروں سے یہ عزم عیاں تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو، وہ بھارت کے دوبارہ غلام نہیں بنیں گے اور یہی ایک جذبہ تھا جو انہیں ہڈیارہ سے نکال لایا تھا۔

میں ان کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اپنے گاؤں کی طرف بھاگ اُٹھا۔ اپنے گاؤں پہنچا تو یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ وہاں کے لوگ ابھی تک اپنے اردگرد کے حالات سے زیادہ باخبر نہ تھے بلکہ اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ پہلے تو لوگوں کا حوصلہ دیکھ کر میرا سر فخر سے بلند ہوگیا اور میں وہ سب کچھ بھول گیا جو راستے میں مَیں نے دیکھا تھا۔ میں نے سوچا کتنے بلند حوصلہ ہیں یہ لوگ! اس سکون کی ایک وجہ یہ تھی کہ میرا گاؤں گو سرحد سے بالکل نزدیک ہے مگر سڑک سے ہٹ کر ہے۔ بھارتی فوج نے سب سے پہلے سڑک پر قبضہ کیا۔ چناں چہ سڑک سے دُور کے دیہات ان کی زد سے دن چڑھنے تک بچے رہے۔ اگر بھارت اپنی پیدل فوج کو داؤکے گاؤں کی طرف سے ہمارے گاؤں کی طرف روانہ کرتا تو ہم بھی کبھی کے ان کے ظلم وستم کا نشانہ بن چکے ہوتے۔

گھر پہنچا، والدین نے دعائیں دیں اور ہماری اللہ رکھی کی آنکھوں سے بھی دو بڑے بڑے آنسو بہہ نکلے۔ وہ دو دنوں سے بیمار تھی اور چارپائی سے نیچے اُترنا اس کے لیے محال تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور والد صاحب کو جو کچھ میں نے دیکھا تھا، بتا دیا۔ اب سوال یہ تھا کہ جلدی سے گاؤں چھوڑ دیں یا وقت کا انتظار کریں۔ میں تو انتظار نہ کرنا چاہتا تھا مگر والد صاحب نے یہ کہہ کر کہ وہ نہیں جائیں گے، میری کمر توڑ دی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ہڈیارہ میں جو کچھ ہوا ہے، وہی کچھ ہمارے گاؤں میں بھی ہو سکتا ہے مگر وہ نہ مانے، کہنے لگے۔ ''سارا گاؤں ہمارے گھر پر نظر لگائے بیٹھا ہے کہ ہم بسم اللہ کریں اور وہ لبیک کہیں۔'' یہ اس لیے تھا کہ ہمارا گھر فوجی روایات کے لیے مشہور تھا۔ ابا جی اپنی جنگی اور فوجی زندگی کی بناء پر کہہ رہے تھے کہ بھارت بغیر اعلانِ جنگ کے ہم پر حملہ نہیں کرسکتا مگر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا تھا، اس فلسفے پر یقین کیسے کرتا۔ مجبوراً چھت پر گیا کہ دیکھوں گاؤں کے اردگرد کیا حالت ہے۔ دُور دُور تک کچھ دکھائی نہ دیا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک ہمارا گاؤں ظالموں سے محفوظ ہے مگر توپ کی آواز برابر آ رہی تھی اور کسی وقت بھی دشمن اس کے دہانے کا رُخ ہمارے گاؤں کی طرف کرسکتا تھا۔

میں گھر سے باہر نکلا کہ دیکھوں گاؤں کے لوگوں کا کیا حال ہے۔ چاروں طرف سے سوالیہ نگاہوں نے مجھے دیکھ کر کچھ بزرگوں نے پوچھا بھی کہ اب کیا کریں؟ میں نے کہا۔ ''ہم مریں گے بھی اکٹھے اور جئیں گے بھی اکٹھے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔'' مگر گاؤں کے لوگوں کی سوالیہ آنکھوں کو دیکھنے کی مجھ میں تاب نہ تھی کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اب ہماری آزادی چند ہی لمحوں کی ہے۔ بھارتی فوج اب آئی کہ آئی، اور ہم سب کو دھکیل کر بھارت لے جائے گی مگر میں یہ بات گاؤں کے لوگوں سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ گھر آیا، دوبارہ چھت پر چڑھ گیا۔ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی اپنی اپنی چھتوں پر کھڑے تھے۔ اچانک ہڈیارہ کی طرف سے شور سنائی دیا۔ غور سے سنا اور دیکھا تو تین اطراف سے دوسرے دیہات کے لوگ ہماری طرف آ رہے تھے اور اب گولے بھی کھلے میدان میں آ کر گرنے لگے تھے، تاہم ہمارا گاؤں بچا ہوا تھا۔ میں بھاگم بھاگ والد صاحب کے پاس آیا جو بڑے اطمینان سے بڑ کے درخت تلے حقہ پی رہے تھے اور والدہ صاحبہ کسی گہری سوچ میں تھیں۔ والدین واقعات سن کر حیران ہوئے مگر ابھی تک بضد تھے کہ وہ گاؤں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ بین الاقوامی اصولوں کے تحت بھارت بغیر اعلانِ جنگ کے ہمارے علاقے پر حملہ نہیں کرسکتا۔ میں نے کافی سمجھایا کہ بھارت جیسے دشمن سے اصولوں کی توقع بے کار ہے۔ سوچ رہا تھا کہ کروں تو کیا کروں۔ بار بار ابا جی اور اماں جی سے درخواست کر رہا تھا کہ خدا کے واسطے عزت و جان کی خاطر اب گاؤں سے چلیں مگر وہ راضی کہاں ہوتے تھے۔ ابا جی نے ایسی ڈانٹ پلائی کہ مجھے بھارتی فوج کی یلغار تک بھول گئی۔ ابھی اسی شش و پنج میں تھے کہ اچانک ایک گولا ہمارے گاؤں کی مسجد میں جو کہ میرے گھر کے دروازے سے بمشکل 25 گز کے فاصلے پر ہوگی، آ کر پھٹا۔ ہم سب کے رنگ اُڑ گئے۔ ہمارے گاؤں کی طرف دشمن کی پیش قدمی ظاہر ہوگئی تھی جو یقیناً گولوں کی آڑ میں بڑھ رہی ہو گی۔ اب والدین نے بھی محسوس کیا کہ میں اب تک جو کچھ انہیں بتا رہا تھا، وہ بالکل سچ تھا اور انہوں نے خود ہی کہا کہ اب چلنا چاہیے۔ خدا کا شکر کیا کہ یہ بزرگ راضی ہوئے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ کیا اُٹھایا جائے اور کیا چھوڑا جائے۔ چھوٹی بہن نے جس کی شادی عنقریب ہونے والی تھی، اپنے جہیز کی چند خاص خاص چیزیں صندوق میں رکھ لیں کہ یہ اُٹھا کر لے چلیں گے مگر حالات نے یک لخت ایسا پلٹا کھایا کہ کسی چیز کا اُٹھانا تو دُور کی بات گھر کے تالے بھی نہ لگا سکے اور 1947ء سے اب تک کی

کمائی وہیں چھوڑ کر خالی ہاتھ جن کپڑوں میں تھے، جان وعزت کی خاطر چل دیئے۔ ہمارا گاؤں سے نکلنا تھا کہ گاؤں کے سارے لوگ قافلے کی صورت میں بی آر بی کی طرف چل پڑے۔

آج میری زندگی میں قافلے کے ساتھ چلنے کا دوسرا موقع تھا۔ ایک تو وہ جب میں ابھی بچہ تھا اور 1947ء میں ہندوستان سے پاکستان آیا تھا، آج بھی ان مشکلات کو یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا وقت تھا! لوگوں کو خون آلود پانی تک پینے کو میسر نہ تھا۔ ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ دوسرا آج کا موقع تھا کہ ہم مکار دشمن کے ہاتھوں اپنے ہی وطن میں بے گھر ہو گئے تھے۔ 1947ء میں تو ہم نے بھارت اس اُمید پر چھوڑا تھا کہ پاکستان میں اپنی حکومت ہوگی۔ ہم کسی کے غلام نہ ہوں گے، اپنی روایات ہوں گی اور اپنا معاشرہ ہوگا مگر آج یہ فکر تھی کہ اب پاکستان سے بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ اس وقت میں بچہ تھا اور دوسروں کے کاندھے کا بوجھ، مگر آج دوسروں کے بوجھ سے کمر ٹوٹے جا رہی تھی۔ خیر اب ان یادوں کا وقت نہ تھا۔

گاؤں سے نکلے تو مرد و زن بوڑھے بچے، عزیز و اقارب گولوں کے سائے میں لاہور کی طرف رُخ کیے چل رہے تھے یا بھاگ رہے تھے۔ اس بھگدڑ کی وجہ یہ تھی کہ جتنی رفتار سے ہم بھاگ رہے تھے، اتنی ہی رفتار سے گولے ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ ہر طرف شور اور افراتفری تھی۔ چاروں طرف دھان کی فصل تھی اور کھیتوں میں پانی کھڑا تھا۔ بس کچھ نہ پوچھئے کیا حالت تھی۔ فصلوں میں گرتے پڑتے انسانوں کا ایک ریلا تھا اور سب کا رُخ ایک ہی طرف تھا، منزل ایک تھی اور وہ تھی بی آر بی نہر۔ جذبہ بھی ایک تھا کہ ہم بھارت کے غلام نہیں بنیں گے۔

اب میرے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ والدہ صاحبہ بوڑھی تھیں اور ہماری اللہ رکھی سخت بیمار۔ کندھے پر اُٹھاؤں تو کس کو؟ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ والدہ صاحبہ کو کندھے پر اُٹھا لیتا ہوں مگر جب میں ان کی طرف بڑھا تو ضعیف رگوں میں جوانوں جیسا خون پایا۔ ”نہیں! میں ٹھیک ہوں، چلو تم اسے (ہماری اللہ رکھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اُٹھا لو۔ وہ بیمار ہے۔“ والدہ صاحبہ نے حکم دیا۔ میں اللہ رکھی کی طرف بڑھا کہ بے چاری کو سہارا دوں تو طعنہ ملا۔ ”شرم نہیں آتی؟ امی جی، ابا جی اور پھر سارے قافلے والے کیا کہیں گے۔ میں ٹھیک ہوں، تم بیٹوں کو سنبھالو۔ میری فکر نہ کرو۔“

”عجیب ہی سماں تھا۔ ہمارے پیچھے گولے تھے، آگے پانی میں ڈوبی ہوئی فصلیں اور لمبے راستے اور انجانے فاصلے۔ گرتے پڑتے ہم سب گاؤں والوں کا قافلہ اب گاؤں سے ذرا دور ہو گیا تھا۔ اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کس طرف چلیں، آیا برکی کو چلیں یا کوریاں کو۔ یہ دونوں گاؤں تقریباً ایک ہی فاصلہ پر ہیں۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ برکی کی طرف سڑک نزدیک ہونے کی وجہ سے خطرہ زیادہ ہے، اس لیے کوریاں گاؤں کی طرف چلا جائے۔ قافلے نے رُخ اس طرف موڑ لیا۔ راستے کا کوئی خاص تعین نہ تھا۔ ہم ایک پگڈنڈی اور فصلوں میں سے گزر رہے تھے۔ قافلے میں ہر ایک دوسرے کو تسلی دے رہا تھا کہ تھوڑا فاصلہ رہ گیا ہے۔

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

راستے میں ہمارے قافلے میں اضافہ ہوتا گیا کیوں کہ دوسرے گاؤں کے لوگ بھی ہمارے قافلے میں شامل ہورہے تھے۔ قافلہ کیا تھا بس لٹا پٹا سا کارواں تھا۔ راستے میں بچوں نے پانی کی خواہش کی جو مجبوری کی وجہ سے رد کردی گئی۔ پانی تو کھیتوں میں بہت تھا مگر پینے کے قابل نہ تھا۔ کوریاں تک کا راستہ جو عام حالات میں دیہاتی لوگ پون گھنٹے میں طے کرلیا کرتے تھے، آج ڈیڑھ گھنٹا گزرنے کے بعد بھی ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ عجیب حالت تھی۔ جتنا ہم تیز دوڑتے یا چلتے تھے۔ فاصلہ اتنا ہی زیادہ ہوتا جاتا تھا اور ہماری حالت یہ تھی کہ نہ واپس جا سکتے تھے، نہ آگے۔ خدا کا شکر کیا جب دو گھنٹے بعد ہم کوریاں گاؤں کے چھپڑ پر پہنچے لیکن یہاں پہنچ کر ہماری رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی، اس لیے کہ گاؤں خالی ہو چکا تھا۔ کچھ بچے کھچے لوگ نظر آئے تو ان سے معلوم ہوا کہ گاؤں والے تو کب کے گاؤں چھوڑ کر برکی چلے گئے ہیں۔

اب طے یہ پایا کہ کسی نہ کسی طرح نہر کو جلد از جلد عبور کیا جائے تاکہ بھارتی فوج کے ظلم سے محفوظ ہو جائیں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اب یہاں سے برکی چلیں مگر کچھ جہاں دیدہ لوگوں نے اس بات کی مخالفت کی اور سمجھایا کہ اب برکی کی طرف جانا حماقت ہو گی۔ یقیناً ہماری فوج نے برکی کا پل توڑ دیا ہوگا کیوں کہ فوری طور پر دشمن کو روکنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہ تھا اور پھر برکی گاؤں بھی خالی ہوگا۔ لہٰذا یہ قرار پایا کہ یہاں سے سیدھے پدری کے پل کو جانا چاہیے۔

اب قافلے کا رُخ سیدھا نہر کی طرف تھا۔ وہاں سے نہر کم از کم ڈیڑھ میل دُور ہو گی مگر ہمیں سیدھے راستے کا علم نہ تھا اور دوسرا راستہ کافی چکر کاٹ کر جاتا تھا، لہٰذا جدھر سے جس نے چاہا نہر کی سمت منہ کر کے چل دیا۔ مجھے بھی چوں کہ کسی راستے کا علم نہ تھا، لہٰذا اپنے گھر والوں کو ایک کچے راستے پر ڈال دیا اور چلتے گئے مگر راستہ لمبا ہوتا گیا۔ دراصل ہم غلط راستے پر تھے۔ گھنٹا بھر کے بعد معلوم ہوا کہ اصل راستہ تو پیچھے رہ گیا ہے۔ واپس ہوئے اور کافی تگ و دو کے بعد ٹھیک راہ پر آئے۔ دھوپ اب تیز ہوگئی تھی۔

وقت تقریباً گیارہ بجے کا تھا۔ بی آر بی ہمیں نظر آرہی تھی مگر ہم ابھی تک نہر سے پرے تھے۔ بھارتی فوج کی گولا باری بدستور جاری تھی مگر ہم نے ہمت نہ ہاری اور خستہ حالت میں تقریباً بارہ بجے بی آر بی نہر پر پہنچ ہی گئے۔

نہر کے قریب ہمیں اپنی فوج نظر آئی تو جان میں جان آئی کہ ہماری عزت کے رکھوالے موجود ہیں۔ نہر کے کنارے پر آج عجیب سماں تھا۔ بے شمار لوگ جلد از جلد نہر عبور کرنے کی کوشش میں تھے مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ سوائے ایک پدری پل کے اور کوئی راستہ نہ تھا اور وہ پل بھی لکڑی کا تھا اور ڈر تھا کہ اب گرا کہ گرا۔ گویا پل کیا تھا ایک پل صراط تھا جس کے نیچے بی آر بی نہر بہہ رہی تھی۔ مشکل سے تقریباً ایک میٹر چوڑا تھا اور عام لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا تھا۔ اصل میں یہ پل آمد و رفت کے لیے نہیں بنایا گیا تھا بلکہ یہ اس واسطے بنایا گیا تھا کہ پدری گاؤں کی کچھ زمین برکی اور کوریاں کے ساتھ نہر کے دوسرے کنارے پر تھی۔ اس گاؤں سے برکی نہر کا پل تقریباً ڈیڑھ میل دُور تھا، لہٰذا یہ مختصر سا پل تعمیر کردیا گیا تھا تاکہ یہاں کے آمد و رفت کی کسانوں کو آسانی ہو۔

پل کے دونوں طرف ہمارے فوجی جوان کھڑے تھے۔ اب ان کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ لوگوں کو پل استعمال کرنے سے روک بھی نہیں سکتے تھے اور وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ پل ٹوٹ جائے کیوں کہ اس کے ٹوٹ جانے سے لوگوں کے لیے نہر عبور کرنے کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ یہ تو اس پل کی ہمت تھی کہ سب کو اپنے سینے سے گزرنے کی اجازت دے رہا تھا۔

آخر پاک فوج کے جوانوں نے پل کا نظام سنبھالا اور لوگوں کو تلقین کی کہ وہ تھوڑی تھوڑی تعداد میں پل سے گزریں ورنہ اگر خدانخواستہ یہ پل بھی ٹوٹ گیا تو کوئی بھی نہ گزر سکے گا۔ پدری پل پر تقریباً بارہ بجے کے قریب ہماری باری آئی۔ جوں ہی میں نے بی آر بی کے لاہور والے کنارے پر قدم رکھا، میرے سامنے 1947ء کا منظر گزر گیا، جب میں نے قافلے کے ساتھ کھالڑہ بارڈر کراس کیا تھا تو کسی نے کہا۔ ''پاکستان آ گیا ہے۔'' تو سب نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ آج یہ پانچ چھ گھنٹوں کا تکلیف دہ سفر پاکستان میں دوبارہ پیدائش سے کم نہ تھا۔

لاہور جانے سے پہلے ایک نظر میں نے نہر کی دوسری جانب ڈالی تو سوائے گرد و غبار کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ پھر میں نے اپنے شیر دل پاکستانی فوجیوں کی طرف دیکھا جو اب مکار دشمن کو موت کا راستہ دکھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اب مجھے کوئی غم، کوئی فکر نہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دشمن کو مزہ چکھانا ہمارے جیالے اچھی طرح جانتے ہیں اور اب دشمن سوائے اپنی موت کے اور کسی جانب نہیں بڑھ سکتا۔

☆☆☆

محمد افنان شیخ، ڈیرہ اسماعیل خان
میں ڈاکٹر بن کر ملک اور انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

محمد رافع، اسلام آباد
میں بڑا ہو کر اُستاد بنوں گا اور بچوں کو اچھی تعلیم دوں گا۔

ارسلان احمد، لاہور
فوج میں شامل ہو کر ملک کی حفاظت کروں گا۔

عبدالرحیم، پیرمحل
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور اپنے والدین کا نام روشن کروں گا۔

معظم علی، حویلی لکھا
پاکستان آرمی میں شمولیت اختیار کر کے ملک کا دفاع کروں گا۔

معاویہ صالح، رحیم یار خان
میں بڑا ہو کر ایک اچھا سیاست دان بننا چاہتا ہوں۔

اویس خالد، گجرات
میں بڑا ہو کر ملک کا ایمان دار وزیرِ خزانہ بننا چاہتا ہوں۔

دعا گل سید، چارسدہ
میں کالج پرنسپل بن کر غریب بچوں کو مفت تعلیم دوں گی۔

انعم انبساط، ٹیکسلا کینٹ
میں ڈاکٹر بن کر تمام لوگوں کا مفت علاج کروں گی۔

ابراہیم آصف، لاہور
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور ملکی سرحدوں کا دفاع کروں گا۔

امیر معاویہ، میانوالی
میں انجینئر بن کر ملک کا نام روشن کروں گا۔

عبدالحسیب، لیہ
میں سافٹ ویئر انجینئر بنوں گا اور ملک وقوم کا نام روشن کروں گا۔

حافظ ناصر علی، لاہور
ایک اچھا اُستاد بن کر بچوں کے تعلیمی سلسلے میں خدمت کروں گا۔

محمد عمیس خان، ڈیرہ غازی خان
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور ملک وقوم کا نام روشن کروں گا۔

رانا محمد فہیم سعید، فیصل آباد
میں پاک فوج میں شامل ہو کر ملک وقوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

سعد اقبال، جہانیاں
میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر بن کر ہومیو پیتھک کے علاج سے لوگوں کو روشناس کرانا چاہتا ہوں۔

ثوبیہ آصف، لاہور
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

لائبہ رؤف، لاہور
میں بڑی ہو کر اُستانی بنوں گی اور تمام بچوں کو تعلیم دوں گی۔

محمد انس، لاہور
میں بڑا ہو کر اپنی جان ملک وقوم کے لیے وقف کرنا چاہتا ہوں۔

قائد کا سراپا

مسز سروجنی نائیڈو، قائد کے سراپے کا یوں نقشہ کھینچتی ہیں:

''وہ بلند قامت ہیں لیکن بے انتہا دبلے اور دیکھنے میں کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی عادتیں رئیسانہ ہیں لیکن ان کی جسمانی توانائی ایک نظر فریب پردہ ہے جس کے پیچھے ذہن اور کردار کی غیر معمولی قوتیں پوشیدہ ہیں۔ وہ روکھے اور تنک مزاج ہیں۔ لئے دیئے رہتے ہیں اور بالعموم لوگوں سے بے تکلفی سے نہیں ملتے، ان کا انداز اکثر تحکمانہ ہوتا ہے، لیکن جو لوگ انہیں جانتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ جناح کی تمکنت اور رعونت کے خول میں ایک بڑی دل کش شخصیت ہے۔ ان کی انسانیت میں بڑا بھولا پن ہے۔ ان کا مشاہدہ ایک عورت کے مشاہدے کی طرح تیز اور نازک ہے۔ ان کے مزاج میں بچوں کے مزاج کی سی شوخی اور دل کشی ہے۔ وہ بنیادی طور پر عملی آدمی ہیں۔ ان کے جذبات پوری طرح ان کے ذہن کے تابع ہیں۔ زندگی کے متعلق ان کے خیالات بالکل غیر جذباتی ہیں، لیکن ان کی دُنیاداری اور حقیقت پسندی کے پردے میں اصول پرستی اور بے غرضی کے بڑے جوہر پوشیدہ ہیں اور یہی اس شخص کے کردار کی بنیادی خصوصیت ہے۔''

قرآن اور ایٹم

انیسویں صدی تک انسان اور سائنس یہی گمان کرتا رہا کہ زمین پر موجود عناصر میں ایٹم ہی سب سے چھوٹا عنصر ہے اور یہ تقسیم کے قابل نہیں، کیوں کہ یہ تقسیم نہیں ہو سکتا اور یہی نظریہ قدیم دور سے آ رہا تھا۔ پھر کچھ عرصہ پہلے سائنس دانوں نے اس نظریہ کو یوں جھٹلایا کہ ایٹم کو تقسیم کر کے دکھایا اور یہ معلوم کیا کہ ایٹم میں تین اور عناصر موجود ہیں:

I- پروٹون، II- نیوٹرون، III- الیکٹرون

اسی تقسیم کے بعد سائنس دان ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنانے کے قابل ہوئے، جب کہ قرآن مجید یہ نظریہ ہمیں چودہ سو سال پہلے بتا چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں: ''اور آپ کے رب کے علم سے کوئی چیز ذرّہ برابر بھی پوشیدہ نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی چیز اس مقدار سے چھوٹی ہے اور نہ کوئی چیز اس سے بڑی ہے، مگر یہ سب کتاب مبین میں ہے۔''

اب اس آیت میں ''ذرّہ'' یعنی ایٹم کا ذکر ہے، پھر یہ فرمایا گیا ہے کہ اس سے چھوٹی اور بڑی چیزوں، سب کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ ایٹم سے چھوٹی چیزیں اس کے عناصر ہی ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا، پس قرآن کریم نے چودہ سو برس پہلے ہمیں ایٹم سے بھی چھوٹی چیزوں یعنی اس کے عناصر کے نظریہ کے بارے میں صراحتاً بتا دیا ہے۔ بے شک قرآن ایک لاثانی معجزہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان کو انگشت بدنداں رکھ چھوڑا ہے۔ سبحان اللہ!

(رمیشا حسن، پشاور)

اقوالِ زرّیں

تعجب ہے......

☆ اس پر جو دوزخ کو سچ مانتا ہے، پھر بھی گناہ کرتا ہے۔

☆ اس پر جو تقدیر کو برحق جانتا ہے، پھر بھی جانے والی چیز کا غم کرتا ہے۔

☆ اس پر جو خدا پر یقین رکھتا ہے اور دوسروں سے بھی مانگتا ہے۔

☆ اس پر جو دُنیا کو فانی جانتا ہے، پھر بھی اس سے محبت کرتا ہے۔

☆ اس پر جو حساب کتاب پر یقین رکھتا ہے، پھر بھی مال جمع کرتا ہے۔

قائد کی سربلندی

1944ء کا ذکر ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح اور گاندھی جی کے درمیان بمبئی میں مذاکرات کا پروگرام تھا۔ اس وقت قائداعظم کشمیر میں تھے۔ وہاں گاندھی جی کا پیغام پہنچا کہ کشمیر سے واپسی میں قائداعظم واردھا آ جائیں، مذاکرات وہیں ہو جائیں گے۔ گاندھی واردھا میں مقیم ہیں، واردھا راستے میں پڑتا ہے۔ قائداعظم نے جواب دیا کہ وہ اپنا پروگرام بدلنے سے قاصر ہیں، واردھا نہیں آ سکتے۔ آخر گاندھی جی کو مذاکرات کے لیے آنا ہی پڑا۔ بعد میں کسی نے قائداعظم سے کہا: ''اگر آپ واپسی پر واردھا رُک جاتے تو کیا

حرج تھا؟" قائداعظم نے جواب دیا: "یہ کوئی ذاتی مسئلہ نہیں، قومی وقار کا معاملہ تھا۔ میں گاندھی کے کہنے پر سر جھکا دیتا تو کانگریس تصویروں کے ذریعے سے دُنیا بھر میں اس کی تشہیر کرتی۔ اس صورت میں میری قوم کو کیا محسوس ہوتا۔ میں اپنی قوم کو کسی کے سامنے جھکتا نہیں دیکھ سکتا۔" ☆

ذہانت

سکھ سلطنت کے مشہور مہاراجا رنجیت سنگھ کے بچپن ہی میں اس کی ایک آنکھ چیچک کی وجہ سے ضائع ہوگئی تھی۔ ایک دن مہاراجا نے شاہی مصور کو اپنی ایک حسین وجمیل تصویر بنانے کے لیے کہا، ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر تصویر پسند نہ آئی تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ مصور نے ہر زاویے سے چہرے کا جائزہ لیا لیکن کانے پن کی وجہ سے بات نہ بن سکی۔ آخر مصور نے ایک ایسی تصویر بنا کر مہاراجا کو پیش کی جو رنجیت سنگھ کو بہت پسند آئی۔ اس نے مصور کو مالا مال کر دیا۔ تصویر میں مہاراجا رنجیت سنگھ تیر کمان سے ایک آنکھ بند کر کے ہرن کا نشانہ لے رہا تھا۔ اس طرح آنکھ بند کرنے سے مہاراجا کی کانی آنکھ کا عیب بھی چھپ گیا اور مصور کی ذہانت نے اس کی جان بھی بچالی اور وہ انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ ☆

گدھے کا کام

فتح کے بعد جب سکندر اعظم یونان کے ایک علاقے میں گیا تو وہاں ایک شخص دنیا سے بے خبر دیوار کے سائے میں سو رہا تھا۔ سکندر نے اسے جگانے کے لیے لات ماری اور کہا۔ "میں نے اس شہر کو فتح کر لیا ہے اور تو ابھی تک بے خبر سو رہا ہے۔" اس شخص نے سکندر کی طرف دیکھا اور کہا۔ "شہر فتح کرنا تو بادشاہ کا کام ہے اور لات مارنا گدھے کا کام ہے۔ کیا دُنیا میں کوئی انسان نہیں بچا، جو بادشاہت ایک گدھے کو مل گئی۔"

(فائزہ رزاق، خانیوال)

ماں کی عظمت

☆ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔
☆ ماں کے بغیر گھر قبرستان ہے۔
☆ ماں کی آغوش انسان کی پہلی درس گاہ ہے۔
☆ ماں زندگی کی تاریک راہوں میں روشنی کا مینار ہے۔
☆ ماں کی نافرمانی کرنا کبیرہ گناہ ہے۔
☆ ماں سے بڑھ کر کوئی اُستاد نہیں۔
☆ ماں کی نافرمانی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔
☆ ماں کی دُعا کامیابی کا راز ہے۔
☆ ماں دُنیا کی عظیم ترین ہستی ہے۔
☆ ماں کی قدر وہی جانتے ہیں جو اس نعمت سے محروم ہیں۔

خیرالبشرؐ کی شگفتگی

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک بوڑھی عورت آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: "یا رسول اللہ ﷺ! دعا کیجیے میں جنت میں چلی جاؤں۔" آپؐ نے فرمایا: "جنت میں کوئی بوڑھی عورت نہیں جائے گی۔" وہ عورت یہ سن کر رو پڑی اور جانے لگی۔ آنحضرتؐ نے لوگوں سے فرمایا۔ "اسے بتا دو کہ وہ بڑھاپے کی حالت میں جوان ہو کر جنت میں جائے گی۔"

(شمائل ترمذی) (احور کامران، لاہور)

حضرت داؤدؑ نے فرمایا:

☆ تجربہ اور جذبہ مل کر نظریہ تشکیل دیتے ہیں۔
☆ اگر مجھ سے اللہ تعالیٰ کا تصور چھین لیا جائے تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔
☆ اللہ تعالیٰ کا خوف انسانوں کو لمبی عمر عطا کرتا ہے۔
☆ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے رہا کرو۔
☆ دُنیا میں سب سے کمزور وہ ہے جس کو اپنی خواہش پر قابو نہ ہو۔
☆ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کیا کرو۔
☆ سب سے بڑی دولت مندی اپنی ضرورتوں کو محدود رکھنا ہے۔

(ثمینہ خان، کوئٹہ)

مہکتی کلیاں

☆ جس کام کو پورا کرنے کی طاقت نہ ہو، اسے اپنے ذمے نہ لو۔
☆ وقت ایک انمول ہیرا ہے، اسے کھو کر پانا ناممکن ہے۔
☆ ہر شخص سچا دوست تلاش کرتا ہے مگر خود سچا بننے کی زحمت نہیں کرتا۔
☆ ذرا سی غفلت مستقبل کو تاریک بنا سکتی ہے۔
☆ عقل کی چابی سے علم کا دروازہ کھلتا ہے۔
☆ پتھروں کے مزاج نہیں ہوتے لیکن لوگ پتھر مزاج کیوں ہو جاتے ہیں۔

(حفصہ اعجاز، صوابی)

ذائقہ کارنر

مدراسی چکن کری

لخما جون

مدراسی چکن کری

اشیاء:

مرغی کا گوشت:	ایک کلو	دھنیا پاؤڈر:	دو چائے کے چمچ	زیرہ پاؤڈر:	دو چائے کے چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر:	ایک چائے کا چمچ	سیاہ مرچ پاؤڈر:	ایک چائے کا چمچ	ہلدی:	ایک چائے کا چمچ
لہسن وادرک پیسٹ:	دو دو چائے کے چمچ	سفید سرکہ:	دو یا تین چائے کے چمچ	پیاز:	ایک عدد
تیل:	چار کھانے والے چمچ	ٹماٹر پیسٹ:	ایک کھانے والا چمچ	کنور چکن کیوبز:	دو عدد (ایک پیکٹ)

ترکیب:

چکن کے ٹکڑے کر کے رکھ لیں۔ سوائے پیاز، کیوبز اور ٹماٹو پیسٹ کے باقی سارے مصالحوں کی پیسٹ بنا لیں۔ تیل گرم کر کے پیاز کاٹ کر ڈالیں اور جب نرم ہو جائے تو تمام مصالحوں کی پیسٹ ڈال کر ایک منٹ تک پکائیں، پھر چکن کے ٹکڑے ڈال کر بھونیں۔ ایک کپ پانی گرم کر کے دونوں کیوبز کو گھول لیں۔ چکن بھن جائے تو ٹماٹو پیسٹ اور کنور چکن کا پانی ملا دیں اور اتنی دیر پکائیں کہ گوشت گل جائے۔ مدراسی چکن کری تیار ہے۔

لخما جون

اشیاء:

'بنی' کے شاہی نان:	دو عدد	ٹماٹو کیچپ:	دو عدد کھانے کے چمچ	شملہ مرچ، ٹماٹر اور پیاز:	ایک، ایک عدد
کش شدہ پنیر:	حسب خواہش یا ایک کپ				

ترکیب:

نان پر کنور ٹماٹو کیچپ پھیلا دیں اور اس پر ٹماٹر کے قتلے، شملہ مرچ کے بیج نکال کر اس کے اور پیاز کے چھلے پھیلا دیں۔ سبزیوں پر پنیر پھیلائیں اور ۲۰۰ درجہ حرارت پر چند منٹ رکھ کر بیک کریں۔ جب پنیر پگھل جائے، اوون سے نکال کر تیز چھری سے لخما جون کی قاشیں کاٹ کر گرم گرم پیش کریں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

آبِ زم زم

آبِ زم زم دو مختلف معنی کا حامل ہے۔ ''آب'' کا مطلب ہے ''پانی'' اور عربی میں ''زم زم'' کا مطلب ہے ''ٹھہر جا یا رُک

جا''۔ لگ بھگ چار ہزار سال سے یہ پانی ایک صحرائی علاقے سے نکل رہا ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کے پاؤں کی رگڑ سے نکلنے والا یہ پانی دُنیا میں سب سے زیادہ احترام کا حامل ہے۔ سوا ارب مسلمان اسے مقدس سمجھ کر پیتے اور استعمال کرتے ہیں۔ شروع میں یہ کنواں بنا جو خشک ہو گیا لیکن حضرت محمد ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے اسے دوبارہ جاری کروایا۔ یہ خانہ کعبہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے جو کعبہ سے 20 میٹر کے فاصلے پر ہے لیکن اب اسے دُور کر دیا گیا۔ موٹر پمپ کے ذریعے مردوں اور عورتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ پانی مہیا کیا جاتا ہے۔ ماضی میں ہاتھ سے ڈول ڈال کر پانی نکالا جاتا تھا۔ یہ کنواں 98 فٹ (30 میٹر) گہرا اور 7 سے 9 فٹ چوڑا تھا۔ یہ پانی بے رنگ اور بے بو ہے جس کی پی ایچ (pH) 7.9 سے 8.0 ہے۔ پانی سوڈیم، کیلشیم، میگنیشیم، پوٹاشیم، فلورائیڈز وغیرہ کا خزانہ ہے۔ عمرہ اور حج پر جانے والے حاجی آبِ زم زم بطور تحفہ ضرور لاتے ہیں۔ یوں یہ پانی دُنیا بھر میں پہنچ جاتا ہے۔

مسور کی دال

مسور کی دال کو انگریزی میں "Lentil"، عربی میں ''عدس''، فارسی میں ''مرجو'' یا ''عدس'' کہا جاتا ہے۔ اس کا سائنسی نام "Lens Esculent" ہے جب کہ ایک قسم "Lens Culinaris" ہے۔ اس کا خاندان "Fabaceae" یعنی مٹر کا خاندان ہے۔ یہ جھاڑی نما پودا ہے جو 40 سینٹی میٹر (16 انچ)

اُونچا ہوتا ہے۔ دال پھلیوں میں لگتی ہے جنہیں "Pods" کہا جاتا ہے۔ یہ دال لگ بھگ 12000 سال سے انسان کے استعمال میں ہے۔ مسور کی دال کا رنگ پیلا، نارنجی، سرخی مائل نارنجی، براؤن یا کالا بھی ہوتا ہے۔ اس کا انحصار پودے کی نوع (Species) پر ہے۔ یہ دال پروٹین کا خزانہ ہے۔ اس کے علاوہ فولیٹ، تھامین، فاسفورس، آئرن، زنک، پوٹاشیم اور سوڈیم بھی پائے جاتے ہیں۔ اس دال میں

وٹامن بی بکثرت موجود ہے۔ اس کے علاوہ وٹامن سی بھی پائی جاتی ہے۔ پیداواری لحاظ سے مسور کی دال پیدا کرنے والے بڑے ممالک میں کینیڈا، بھارت، آسٹریلیا، ترکی اور نیپال شامل ہیں۔ یہ دال چاول اور سالن کی شکل میں بڑی مقبول ہے۔ اُردو ادب میں ''یہ منہ مسور کی دال'' کا محاورہ بھی بولا اور لکھا جاتا ہے۔

پستول

پستول(Pistol) ایک ہتھیار ہے جو ہاتھ سے استعمال کیا جاتا ہے۔ گولی یا بلٹ(Bullet) کو فائر کیا جاتا ہے۔ جسے لگتی ہے وہ مر جاتا ہے یا کم از کم شدید زخمی ضرور ہو جاتا ہے۔ اسے عربی میں ''سلاح'' یا ''مسدس'' اور فارسی میں ''اسلحہ دستی'' کہا جاتا ہے۔ 16 ویں صدی میں اسے بطور گن ایجاد کیا گیا۔ 16 ویں صدی سے آج

تک اس کی شکل وٹیکنالوجی میں خاصی تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ شروع میں سنگل شاٹ پستول متعارف کروائے گئے۔ اس قسم کی پستول میں Lead (لیڈ) کی بنی گیند نما گولیاں بھری جاتی تھیں اور انہیں دشمن یا مجرم پر فائر کیا جاتا تھا۔ ابتداء میں اسے شکار کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ بعدازاں ملٹی بیرلڈ(Multi-Barreled) پستول آ گئے۔ ان کی کارکردگی خاصی بہتر تھی اور دُور تک فائر ہو سکتی تھی۔ 1850ء میں میگزین ڈالنے والی پستول آئی جس سے ایک وقت میں لگاتار کئی فائر کیے جا سکتے تھے۔ 19 ویں صدی میں پستول کی جدید شکل ریوالور(Revolver) کی صورت میں متعارف ہوئی۔ گراری کی طرح گھومتی اس پستول سے کئی گولیاں باری باری فائر کی جا سکتی تھیں۔ اس کے بعد سیمی آٹومیٹک اور 2013ء میں 3D پرنٹڈ (Printed) پستول بھی مارکیٹ میں آ گئے ہیں۔ اندازہ ہے کہ 13 ویں صدی میں اہلِ چین بھی پستول نما ہتھیار استعمال کرتے تھے۔

کوئل

پرندوں کی دُنیا میں کوئل (Cuckoo) اپنی دلکش آواز کے باعث جانی جاتی ہے۔ اس کی سریلی آواز اس کے حلق میں موجود "Syrinx" کی وجہ سے ہے۔ اس کا سائنسی نام "Crotophaga Ani" اور کلاس اے ویز(Aves) ہے۔ اسے

عربی میں ''طیور الوقواق'' اور فارسی میں ''کوکو'' کہتے ہیں۔ ان کی کئی اقسام ہیں جو وزن میں 17 گرام سے 630 گرام، لمبائی میں 6 انچ (15 سینٹی میٹر) سے 25 انچ (63 سینٹی میٹر) تک ہو سکتی ہیں۔ یہ پرندہ پوری دُنیا میں پایا جاتا ہے۔ کیڑے پتنگے اور بیج ان کی پسندیدہ غذا ہے۔ ان کی کچھ اقسام ہجرت کرتی رہتی ہیں اور کچھ اقسام مستقل ٹھکانہ اختیار کرتی ہیں۔ کوئل تنہائی پسند جانور ہے اور بمشکل یہ دو کی شکل میں اکٹھے رہتے ہیں۔ کوئل اپنی سریلی آواز میں جب بولتی ہے تو وہ اعلان کرتی ہے کہ یہ میرا علاقہ ہے۔ یہاں میں رہتی ہوں۔ ان کی کئی اقسام رات کو نکلتی ہیں اور خوب صورت آوازیں نکالتی ہیں۔ کچھ اقسام انڈے اپنے گھونسلے میں دیتی ہیں اور کچھ اقسام دوسرے پرندوں کے گھونسلے میں انڈے دینا پسند کرتی ہیں۔ دُنیا کا شاید کوئی ادب ہو جس میں کوئل پر کہانیاں، مضامین، گیت، نظمیں اور شاعری نہ لکھی گئی ہو۔ ☆☆☆

باکسنگ

باکسنگ یا مُکّا بازی بہت قدیم کھیل ہے۔ یہ کھیل سب سے پہلے یونان میں کھیلا گیا اور پھر روم میں رائج ہوا۔ یونانی اور رومن باکسر ہاتھوں میں چمڑے کے دستانے پہنتے تھے جن کے اندر سیسہ بھرا ہوتا تھا۔ یہ بہت خطرناک کھیل تھا اور اکثر مقابلوں میں کوئی نہ کوئی باکسر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا تھا۔ جب بیسیوں کھلاڑی مارے گئے تو دستانوں میں سے سیسہ نکال دیا گیا۔

انگلینڈ میں اس کھیل کی ابتداء اٹھارہویں صدی میں ہوئی اور 1719ء میں لندن میں پہلا باکسنگ بوتھ کھولا گیا۔ جیک براؤن پہلا شخص تھا جس نے اس کھیل کے قاعدے قانون بنائے جو بعض تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی رائج ہیں۔ پیشہ وارانہ باکسنگ کے آٹھ درجے ہیں: فلائی ویٹ، بنٹم ویٹ، فیدر ویٹ، لائٹ ویٹ، ویلٹر ویٹ، مڈل ویٹ، لائٹ ہیوی ویٹ اور ہیوی ویٹ۔ ہر مقابلے میں کم از کم پندرہ راؤنڈ ہوتے ہیں اور ہر مقابلہ کم از کم بارہ منٹ کا ہوتا ہے۔

باکسنگ رنگ (اکھاڑہ) 12 مربع فٹ سے کم اور 16 مربع فٹ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ رنگ کے گرد اوپر نیچے کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ تین رسّے باندھے جاتے ہیں، جن پر نرم کپڑا لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ رنگ کے چاروں کونوں میں چار گدے باندھے جاتے ہیں تاکہ باکسر زخمی نہ ہوں۔ فرش پر ربڑ ڈال کر کینوس یا ترپال بچھا دی جاتی ہے۔ رنگ میں دو رنگ دار اور دو سفید (نیوٹرل) کارنر ہوتے ہیں۔ رنگ دار کارنروں کا رنگ لال اور نیلا یا لال اور سبز ہوتا ہے۔ کارنروں میں مندرجہ ذیل اشیاء رکھی ہوتی ہیں: سٹول، ٹھنڈے پانی کی بالٹی، شیشے کا بیکر، تولیہ اور اسفنج، لکڑی کے برادے کا برتن اور گندہ بروزہ۔

مقابلے سے پہلے دونوں باکسر ہاتھ ملاتے ہیں۔ اس صورت میں دونوں کے دستانے آپس میں آنکڑے کی طرح ملنے چاہئیں۔ صرف دستانے سے دستانہ ٹکرانا کافی نہیں۔ مقابلے کے بعد بھی، نتیجے کے بعد، دونوں کھلاڑی ہاتھ ملاتے ہیں۔ باکسر اپنے مخالف کے جسم یا سر کے سامنے والے حصے یا سائیڈوں پر ضرب لگاتا ہے۔ پٹی (بیلٹ) سے نیچے مُکّا مارنا خلاف قانون ہے۔ اگر مُکّا نشانے پر نہ لگے تو باکسر کو پوائنٹ نہیں ملے گا۔ سر سے ٹکر مارنا، دستانے کے اندر والے حصے سے ضرب لگانا یا کہنی مارنا بھی قانون کے خلاف ہے۔ مقابلے کے خاتمے پر دونوں باکسروں کا اسکور برابر ہو تو مقابلے کے دوران بہتر دفاعی کھیل کا مظاہرہ کرنے والے کو ایک زائد پوائنٹ دیا جاتا ہے۔

کسی باکسر کے جسم کا کوئی حصہ (پاؤں کے سوا) زمین سے چھو جائے یا وہ رسّوں سے باہر ہو جائے یا بے بس ہو کر رسّوں پر لٹک جائے تو وہ ''ڈاؤن'' سمجھا جائے گا۔ اس صورت میں ٹائم کیپر دس سیکنڈ کا ریکارڈ رکھے گا اور ہر سیکنڈ پر ریفری کو بازو ہلا کر اشارے کرے گا۔ اس کے اشارے کے ساتھ ساتھ ریفری باکسر کے سامنے اشارے کے ساتھ منہ سے کاؤنٹ کرے گا۔ اگر دس سیکنڈ کے اندر اندر باکسر کھڑا ہو گیا تو خیر، ورنہ وہ ہار جائے گا۔

بعض طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ کھیل انسان کی جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ فٹ بال، ہاکی اور کرکٹ وغیرہ میں کسی کھلاڑی کو جان بوجھ کر زخمی کرنا خلافِ قاعدہ ہے، لیکن باکسنگ میں یہ جائز ہے۔ اس کھیل میں اگر باکسر دوسرے باکسر کے جبڑوں پر ایک زناٹے دار مُکّا مارتا ہے تو اسے بہت بڑا پوائنٹ سمجھا جاتا ہے۔

☆☆☆

چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے

ایک شخص کسی بزرگ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کی کہ وہ ایک بُرا آدمی ہے، چوری اس کا پیشہ ہے، وہ جوا بھی کھیلتا ہے اور اب اسے اپنے کردار پر ندامت ہونے لگی ہے۔ وہ کیا کرے کہ اس کی بری عادتیں چھٹ جائیں؟

بزرگ نے اسے ہدایت کی کہ وہ سب سے پہلے جھوٹ بولنا چھوڑ دے اور ہر دوسرے دن حاضر ہو کر بیان کرے کہ وہ اس دن کیا کرتا رہا؟ یہ ہدایت سن کر چور اُٹھ کر چلا گیا اور اسی رات معمول کے کاموں سے فارغ ہو کر سونے کے لیے لیٹ گیا، مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اپنی عادت کے موجب ذہن اسے اکسا رہا تھا کہ چل کر کہیں چوری کرے۔ جب کسی کروٹ چین نہ آیا تو وہ مجبور ہو کر اُٹھا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرے؟ اگر چوری کرے تو بزرگ کے رو برو جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کر سکے گا اور سچ بولا تو چوری کے جرم میں پکڑا جائے گا، اب کرے تو کیا کرے؟

اس کے ہمسائے کے ہاں رات کوئی تقریب تھی۔ کچھ سامان باہر صحن میں بکھرا پڑا تھا۔ چور نے اپنی چوری کی عادت پوری کرنے کے لیے اس سامان کو اُٹھا اُٹھا کر پہلے تو باہر رکھا۔ اسی مصروفیت میں آدھی سے زیادہ رات گزر گئی۔ اب رات ڈھلے اس نے دوبارہ وہ سارا سامان اُٹھا اُٹھا کر ہمسائے کے صحن میں جوں کا توں رکھ دیا اور جیسے پھلانگ کر اندر گیا تھا، ویسے ہی دیوار پھلانگ کر گھر واپس آ گیا اور آرام سے سو گیا۔

صبح وہ بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رات کا سارا واقعہ سنایا۔ اس کا بیان سن کر مجلس میں موجود ایک شخص کہنے لگا:

”خوب! یہ تم اچھی ہیرا پھیری میں رات بھر لگے رہے۔“

اس سے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ چور چوری سے ہٹ جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں ہٹ سکتا۔“ دوسرا بولا۔

بچو! یہ ضرب المثل ایسی صورت حال پر صادق آتی ہے جب کوئی شخص بڑی غلطی تو چھوڑ دے مگر عادتاً یا فطرتاً میں پائی جانے والی معمولی بُرائی پر قائم رہے۔

☆☆☆

بوئر برڈ

محمد حسنات حمید

رنگوں کی بہار سے پرندوں کے بیان میں یہ مشکل آ سکتی ہے کہ اسے اپنی زبان میں کوئی نام دینا مشکل ترین ہوتا ہے جس کی ایک مثال بوئر برڈ ہے جو پانچ رنگوں کی مختلف اقسام میں پایا جاتا ہے۔ نیچرل ہسٹری کے مطابق اس کی درجہ بندی کرتے وقت پانچ رنگوں کے اختلاف مگر ایک ہی نوع، ایک جیسی صفات کی وجہ سے اسے بوئر برڈ کا نام دیا جاتا ہے۔ بوئر کے لفظی معنی حجلہ آرائش کے ہیں۔ ایسا گھر جسے سلیقہ مندی سے بنایا گیا ہو۔ بوئر برڈ کا سال بھر کا زیادہ وقت گھونسلا سازی میں گزرتا ہے۔ اسے سجانے میں بہترین ''سامان'' کو اکٹھا کرنے میں اسے جو مہارت حاصل ہے وہ دُنیا بھر کے اسی نوع کے دوسرے پرندوں میں نہیں ہوتی۔ بوئر برڈ ذوق آرائش کی اسی وجہ سے انسانی صفات والا پرندہ شمار کیا جاتا ہے۔ یہ پرندہ صرف آسٹریلیا میں پایا جاتا ہے۔ بعض دوسرے پرندوں کی طرح وہاں سے ہجرت بھی نہیں کرتا۔ جس جگہ رہتا ہے، وہیں جیتا وہیں مرتا ہے۔ اپنی زمین سے پیوستہ رہتا ہے، اس کو ''ذہین پرندہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس بات کا اظہار اس کے گھونسلا بنانے اور سجانے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ گھونسلا بنانے میں ایک خاص قسم کی ترتیب کو ملحوظ رکھتا ہے۔ دیکھنے پر ایسا لگتا ہے جیسے کسی معمار نے نہایت مہارت کے ساتھ بنایا ہو۔ گھونسلا تیار ہونے کے بعد وہ اسے سجانے میں ایسی رنگ دار اشیاء دُور و نزدیک سے اُٹھا کر یہاں لاتا ہے کہ اس پر حیرت ہوتی ہے اور دوسری حیرت کی بات یہ ہے کہ تمام تر اشیاء شوخ رنگوں کی جھلک لیے ہوتی ہیں۔ ان میں دوسرے پرندوں کے رنگین پَر، سمندری گھونگے، پھول اور ایسے خوش نما پودوں کے پتے جو تازہ معلوم ہوتے ہوں۔ حتیٰ کہ اس گھونسلے میں پائی جانے والی اشیاء میں چلے ہوئے کارتوسوں کے ڈھکنے جو رنگین ہوں۔ ایک بار ایک سائنس دان نے گھونسلا بنانے کی تکنیک میں انسان جیسی تعمیری صفت کا کھوج لگانے کے لیے ایک گھونسلے میں ایسی اشیاء بھی دیکھیں جنہیں چونچ میں اُٹھا کر لانے کے قیاس پر یقین نہیں آ سکتا۔ یہ اشیاء پلاسٹک کی بنی چمٹیاں ہیں جو دھلے کپڑوں کو رسّی پر ڈال کر ان کے اوپر لگا دی جاتی ہیں تا کہ ان کپڑوں کو رسّی سے نیچے نہ گرا سکے حالاں کہ یہ چمٹیاں مضبوط گرفت دار ہوتی ہیں۔ انہیں رسّی سے اُتارنا یا گری پڑی صورت میں اُٹھانا بوئر برڈ کی خوبی شمار کی جاتی ہے۔ کلیری ملر نے اس کی بات پر بہت تحقیق کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بوئر برڈ کو ''سٹارلنگ فیملی'' سے تعلق رکھنے والا پرندہ بھی کہا جاتا ہے۔ فاختہ جیسی جسامت رکھنے والا پرندہ پانچ رنگوں اور پانچوں اقسام کی مختلف جسامتوں نے اسے ماہرین

کے نزدیک عجوبہ بنا رکھا ہے۔ رنگین اشیاء اکٹھی کرنے کے علاوہ یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ اپنی چونچ میں "سیال رنگ" بھی بھر کر لاتا ہے اور اسے اپنے گھونسلے کی "چوبی دیواروں" پر ایسے انڈیلتا ہے جیسے اس پر روغن پھیرتا ہو۔

گھونسلے کو بنانے میں ایسی ٹہنیوں کو ایک ترتیب کے ساتھ کھڑا کرتا ہے کہ جیسے کسی عمارت کی تعمیر کے لیے چنائی کی جاتی ہے اور اندر آنے کے لیے راستہ اپنی جسامت کے مطابق رکھتا ہے اور اس میں ایسی ترتیب ہوتی ہے جس سے اس کی ذہانت کا پتا چلتا ہے۔ اس کا زیادہ وقت گھونسلا بنانے میں، رنگین اشیاء کی تلاش میں انسانی گھروں کے نزدیک گزرتا ہے۔ اگر اسے کسی باتھ روم کے روشن دان یا کھڑکی میں رکھا ٹوتھ برش نظر آ گیا تو اسے اُٹھانے میں وہ وہاں پہروں منڈلاتا رہے گا، حتیٰ کہ وہ اسے اُٹھا کر نہ لے جائے اور اگر کسی وجہ سے اسے اُٹھانے میں ناکامی ہو جائے تو دوسرے دن پھر اس کوشش میں لگ جاتا ہے۔ بار بار کوشش کرنا انسان کی کامیابی کی علامت بھی ہے اور ایک پرندے میں بھی موجود ہے تو اسے ایک مثال بھی کہا جا سکتا ہے جو ایک پرندہ بندے کے لیے پیش کرتا ہے۔

بوئر برڈ گھونسلا بناتے وقت تھکن کی صورت میں گھونسلے کے قریبی درختوں پر "آرام" کرنے کے لیے بیٹھ جاتا ہے۔ گھونسلا بنانے کے "فن" سے آگاہی اسے نو سال تک ٹک کر بیٹھنے نہیں دیتی۔ موسم بہار آنے پر اس کی "ابتدائی اینٹ" رکھتا ہے۔ ابتداء میں اسے اس قابل بنا لیتا ہے کہ اس کے اندر بیٹھ سکے، انڈے سی سکے اور پھر ہر موسم بہار آنے پر اس کی آرائش کرتا رہتا ہے۔ نومبر اس کی تعمیر میں صرف کرتا ہے۔ موسمِ بہار میں تعمیر کا آغاز اس لیے کرتا ہے کہ بہار پھولوں کا موسم ہوتا ہے۔ طبع بھی لطیف ہوتی ہے، انسان کی طرح پرندہ بھی اس سے متاثر ہوتا ہے۔

اکثر پرندوں میں گھونسلا اس کی مادہ بناتی ہے مگر بوئر برڈ کو مرد میدان کہنا چاہیے کہ وہ سارا کام خود کرتا ہے اور اس کے نواع میں دوسرے پرندے بھی گھونسلا بنانے کی تیاری میں لگے نظر آتے ہیں مگر جو جتنا بڑا گھونسلا بناتا ہے، وہی "بادشاہ" شمار ہوتا ہے۔ "بادشاہ" دوسرے پرندوں کی عدم موجودگی میں ہر ایک کے گھر جھانکتا پھرتا ہے اور اگر اسے وہاں رکھی ہوئی کوئی چیز پسند آ گئی تو اسے چرا کر اپنے گھونسلے میں لے آتا ہے۔ جب دوسرا پرندہ یہ چوری بھانپ لیتا ہے تو اسے واپس لینے آتا ہے تو "بادشاہ" اور "رعیت" میں لڑائی ہو جاتی ہے۔ جو وقفے وقفے سے کئی دن جاری رہتی ہے مگر جیت بادشاہ کی ہوتی ہے۔ بوئر برڈ جس کا رنگ گہرا نیلا ہو وہی بادشاہ ہوتا ہے کیوں کہ یہ باقی قسموں کے رنگ رکھنے والوں میں سب سے زیادہ بہادر اور چور بھی ہوتا ہے۔ اس لیے باقی سب اس کے آگے ہاتھ پیر باندھے نظر آتے ہیں۔

بلیو بوئر برڈ کی ایک عادت یہ بھی نوٹ کی گئی ہے کہ وہ نیلے رنگ کے پھولوں کی پتیاں اُتارنے میں گہری دل چسپی رکھتا ہے اور اگر شاخ پر لگا نیلا پھول کلی جتنا بڑا ہے تو وہ اسے پودے سے نوچ لیتا ہے۔ ایک بار ایک محقق نے نیلے بوئر برڈ کے گھونسلے میں دو سو کے قریب نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول جمع دیکھے تھے جو سب کے سب تازہ تھے۔

اس کی دوسری عادت میں ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ وہ صبح کے وقت اپنے گھونسلے میں پر پھیلا کر بلند "آواز" جو مرغ کی آواز سے ملتی جلتی ہے، بولتا ہے اور جو مادہ اس کے ساتھ گھر داری کے لیے آمادہ ہو، وہ گھونسلے کے دروازے میں آ کر بیٹھ جاتی ہے اور یوں وہ دو اور پھر دو سے چار بن جاتے ہیں اور یہ عمل جاری رہتا ہے۔

☆☆☆

عجیب ٹیکسی ڈرائیور

برطانوی وزیرِاعظم چرچل نے ایک دفعہ دوسری عالمی جنگ کے دوران ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور بی بی سی لندن سے تقریر کرنے کے لیے ریڈیو اسٹیشن پہنچے، وہاں پہنچ کر چرچل نے ڈرائیور سے کہا۔ "اگر تم پندرہ منٹ تک انتظار کر سکو تو میں واپسی پر بھی تمہاری ٹیکسی پر ہی واپس جاؤں گا۔" ڈرائیور چرچل کی شکل وصورت سے واقف نہ تھا۔ وہ چیختے ہوئے بولا۔ "لیکن مجھے تو چرچل کی تقریر سننی ہے۔" اس پر خوش ہو کر چرچل نے کہا۔ "لگتا ہے، تمہیں اپنے لیڈر سے بہت پیار ہے۔ ٹھیک ہے، تم جاؤ!" ٹیکسی ڈرائیور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "ونسٹن چرچل جائے بھاڑ میں، آپ واپس آ جائیے! میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

(اسامہ بن خرم، گوجر خان)

یہ آیۂ نو جیل سے نازل ہوئی مجھ پر
گیتا میں ہے قرآن تو قرآن میں گیتا
کیا خوب ہوئی آشتی شیخ و برہمن
اس جنگ میں آخر نہ یہ ہارا نہ وہ جیتا
مندر سے تو بیزار تھا پہلے ہی سے "بدری"
مسجد سے نکلتا نہیں، ضدی ہے "مسیتا"

(محمد عارف، کبیر والا)

آسمانوں سے پوچھ نہ منزل کا راستہ
اپنے سفر میں راہ کے پتھر تلاش کر
ذرّے سے کائنات کی تفسیر پوچھ لے
قطرے کی وسعتوں میں سمندر تلاش کر

(سنیعہ شکیل)

غم بانٹنے کی چیز نہیں، پھر بھی دوستو!
اک دوسرے کے حال سے واقف رہا کرو

(فائزہ رزاق، خانیوال)

بات نیت کی صرف ہے ورنہ
وقت سارے دُعا کے ہوتے ہیں
قرب کے نہ وفا کے ہوتے ہیں
جھگڑے سارے انا کے ہوتے ہیں

(عدن سجاد، جھنگ صدر)

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکتِ میانۂ حق و باطل نہ کر قبول
تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشین ہو تو محمل نہ کر قبول

(مومنہ عامر حجازی، لاہور)

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

(بشریٰ حسین، کلورکوٹ)

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض چکائے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

(نجم السحر، ملک وال)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(مرزا حسن، فیصل آباد)

وہ بات کیسی جس میں خبر نہ ہو
وہ دعا کیسی جس میں اثر نہ ہو
میں یہ کیسے کہہ دوں میری عمر تمہیں لگ جائے
کیا پتا اگلے لمحے میری عمر ہی نہ ہو

(عشرہ امین، لاہور)

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

☆

عشق و فریاد لازم تھی سو وہ ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر اس فریاد کی تاثیر دیکھو

☆

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

(محمد احمد خان غوری، جویریہ غوری، بہاول پور)

☆☆☆

ہم غازی پاک وطن کے
ہم غازی پاک وطن کے سرحد پہ کھڑے ہیں تن کے
ہیں صاف اور کھرے من کے پر دُشمن ہیں ، دُشمن کے
کم زور نہ سمجھو ، ہم ہیں لوہے سے بھی سخت بدن کے
ہم غازی پاک وطن کے
ہم سے ہے شان وطن کی اور اس سے شان ہماری
قربان ہے اس پہ تن من آباد رہے یہ آنگن
ذرّے ہیں ستاروں جیسے اس پیارے پاک چمن کے
ہم غازی پاک وطن کے
مت اُلجھے دُشمن ہم سے ڈرتے نہیں توپ اور بم سے
جب بھی وہ ہمیں للکارے ہم بھرتے ہیں خوب طرارے
اور اس کی صفوں کے اوپر گرتے ہیں بجلی بن کے
ہم غازی پاک وطن کے
میدان، پہاڑ اور صحرا دیتے ہیں ہمیں سب رستہ
دریا اور ندی نالے ہیں اپنے دیکھے بھالے
ہر لمحہ چوکس ہیں ہم رکھوالے کھیت اور بَن کے
ہم غازی پاک وطن کے
سرحد پہ کھڑے ہیں تن کے
حفیظ الرحمٰن احسن

بہزاد چونکہ بچوں میں سب سے بڑے تھے، اسی لیے تمام چھوٹوں کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ان کو بہزاد بھائی کہا کریں۔اگر کوئی بچہ بھول کر بھی انہیں صرف نام سے پکارتا تو اسے گوشمالی دی جاتی تاکہ چھوٹے بڑوں کا ادب کرنا سیکھیں اور بدتمیز نہ ہو جائیں۔

خیر یہ تو بہزاد بھائی کے نام کا قصہ تھا، اب ذرا ان کے طوطے کی کہانی سنیے کہ آخر یہ طوطا کہاں سے آیا اور اس کے ساتھ کیا ہوا؟

واقعہ کچھ یوں ہے کہ گرمیوں کی ایک دوپہر جب باقی گھر والے آرام کر رہے تھے اور بہزاد بھائی اسکول کا کام کر رہے تھے کہ اچانک انہوں نے کوؤں کو شور مچاتے سنا۔وہ دوڑ کر باہر آئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بے چارے زخمی طوطے کو ہر طرف سے ظالم کوؤں نے گھیر رکھا ہے۔بہزاد بھائی نے فوراً طوطے کو اُن کے چنگل سے چھڑایا اور اسے اپنے کمرے میں لے آئے۔طوطے کی مرہم پٹی کی، پانی پلایا اور امرود بھی کھلایا۔کچھ دیر بعد سبھی چھوٹے بڑے جمع ہوگئے اور طوطے کی مزید خاطر تواضع ہونے لگی۔کوئی چوری لے کر آیا تو کوئی سیب، کسی نے اُبلا ہوا آلو دیا تو کسی نے کیلا اور کھلانے پلانے کا یہ سلسلہ ہرگز تھمتا نظر نہ آتا تھا۔ یہاں تک کہ بیچارے طوطے کو بدہضمی ہوگئی۔

اب اس کا نام رکھنے پر بحث چھڑ گئی۔سب سر جوڑ کر بیٹھے۔ ہر کوئی اپنی گا رہا تھا۔ چیخم دھاڑ مچی ہوئی تھی۔ آخر کار ایک طویل اجلاس کے بعد طوطے کا نام ''میاں مٹھو'' رکھ دیا گیا۔ بہزاد بھائی کو یہ صدیوں پُرانا نام بالکل پسند نہیں آیا مگر وہ کیا کر سکتے تھے۔ ہر طرف سے میاں مٹھو، میاں مٹھو کے نعرے بلند ہو رہے تھے اور طوطا یوں آنکھیں مٹکا رہا تھا جیسے اسے بھی میاں مٹھو کہلوانا پسند ہو۔

پھر یہ ہوا کہ ہر روز پورے محلے سے بچوں کی ٹولیاں طوطے کو دیکھنے کے لیے آنے لگیں۔ طرح طرح کے سوالات اُٹھائے جانے لگے۔ مثلاً طوطا کیا کھاتا ہے؟ کیا پیتا ہے؟ اسے کون سا کیک پسند ہے؟ کس قسم کا جوس اچھا لگتا ہے؟ کیا وہ آئس کریم بھی کھا سکتا ہے؟

بہزاد بھائی اس قسم کے بے سروپا سوالوں کے جواب دیتے دیتے جمائیاں لینے لگتے مگر پوچھنے والے نہ تھکتے تھے۔ پھر ان کی یہ مشکل بھی طوطے نے آسان کر دی۔اب وہ خود ہی جواب دیتا جاتا۔

مثال کے طور پر جب اس سے پوچھا جاتا کہ:

''میاں مٹھو کیا کھاتا ہے؟''

تو وہ ٹپ سے بولتا۔

''میاں مٹھو چوری کھاتا ہے۔''

''طوطا کیا پیتا ہے؟''

"طوطا شربت پیتا ہے۔"
"کون سا؟"
"اُف!" طوطا اپنا سر پیٹ لیتا۔

رٹو طوطے کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے بہزاد بھائی چاہتے تھے کہ وہ جلد از جلد کم از کم پانچ سات زبانیں سیکھ لے۔ بہزاد کے بابا کو فرانسیسی آتی تھی اور ان کے ایک دوست چینی زبان جانتے تھے۔ دونوں صاحبان نے چند الفاظ طوطے کو سکھا دیئے۔ اب تو ہر طرف طوطے کا طوطی بولنے لگا کیوں کہ وہ اُردو سمیت سات زبانیں فرفر بولتا تھا۔

بہزاد بھائی کے پڑوس میں نعیم صاحب رہتے تھے۔ وہ بچوں کے اخبار میں فوٹوگرافر تھے۔ جب انہوں نے اس انوکھے طوطے کا شہرہ سنا تو فوراً کیمرہ اُٹھائے آن پہنچے۔ اگلے روز طوطے کی تصاویر اخبار میں چھپ گئیں۔ قصہ کوتاہ چار دنوں میں طوطا شیطان سے زیادہ مشہور ہوگیا۔

ارے بھئی! ہم آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ طوطا رہتا کہاں تھا؟ تو سنئے جناب! اُس کے رہنے کے لیے ایک خوب صورت سا پنجرہ بنوایا گیا تھا جسے پھولوں اور ڈالیوں سے خوب آراستہ کیا گیا تھا۔ طوطے کے آرام کا اتنا خیال رکھا جاتا تھا کہ اگر اسے چھینک بھی آجاتی تو بہزاد بھائی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ جاتے۔

اب طوطے کے نئے چٹکیلے پر نکل آئے تھے۔ بچے بے حد خوش تھے کہ طوطا ان کے ساتھ ضرور آنکھ مچولی کھیلے گا اور وہ اسے پتنگ اُڑانا بھی سکھائیں گے بلکہ بچوں کو پورا یقین ہو چلا تھا کہ میاں مٹھو کے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے اُس کا نام گینز بک آف دی ورلڈ ریکارڈ میں درج کیا جائے گا۔ چناں چہ طوطے کی آؤ بھگت پہلے سے کہیں زیادہ ہونے لگی تھی۔ اس کے گرد بچوں کا جمگھٹا لگا رہتا مگر اس کے باوجود میاں مٹھو کچھ رنجیدہ رہنے لگا تھا۔ نہ شوق سے چُوری کھاتا نہ ہی زیادہ ٹیں ٹیں کرتا۔

آخر کار یہ ہوا کہ طوطے نے کھانا پینا بالکل ترک کر دیا۔ بہزاد بھائی کی تشویش میں اضافہ ہوگیا۔ ایک شام وہ افسردگی کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اماں اور بابا ان کے پاس آئے اور اُداسی کا سبب پوچھا۔ بہزاد نے انہیں طوطے کی پُراسرار بیماری کے متعلق بتایا۔

"لیکن مجھے ایسا نہیں لگتا کہ میاں مٹھو بیمار ہے۔" بابا کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"پھر وہ اتنا خاموش کیوں ہے؟" بہزاد نے فکرمندی سے پوچھا۔

"میرے خیال میں وہ کچھ غور و فکر کرتا رہتا ہے۔" بابا نے بہزاد کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ہاں! میاں مٹھو یہ سوچتا رہتا ہے کہ وہ کس طرح قید سے رہائی پائے۔" اماں بولیں۔

"لیکن پنجرے میں اسے ہر طرح کا آرام و آسائش حاصل ہے۔ کوئی بھی اُسے تنگ نہیں کرتا۔ پھر وہ اداس کیوں ہے؟" بہزاد

نے پوچھا۔

''اچھا بیٹا! تم یہ بتاؤ کہ پرندوں کے پَر کس لیے ہوتے ہیں؟'' بابا نے اچانک سوال کیا۔

''اُڑنے کے لیے۔'' بہزاد نے بے ساختہ جواب دیا۔

''تو پھر اسے اُڑنے دو۔'' بابا نے پیار سے سمجھایا۔

''ہاں، میرے بچے! طوطے کو آزاد کر دو۔'' اماں نے بابا کی تائید کی۔ ''ورنہ پنجرے میں اُس کا دم گھٹ جائے گا۔ وہ اُڑان بھرنا چاہتا ہے۔ اپنے دوست پرندوں سے ملنے کی تمنا کرتا ہے۔''

''میں بھی تو اُس کا دوست ہوں۔'' بہزاد غمگین ہو گیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر طوطا پنجرے میں کبھی خوش نہیں رہ سکتا، خواہ تم اُس کے لیے کچھ بھی کرو۔'' بابا نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

''لیکن میں اُسے خود سے جدا نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے بہت پیارا ہے۔'' بہزاد نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''جیسے تمہاری مرضی۔'' اماں بولیں اور وہ دونوں وہاں سے چلے گئے مگر طوطا تو جیسے بہزاد بھائی سے روٹھ گیا تھا۔ نہ ان کے ہاتھ سے کچھ کھاتا پیتا اور نہ ہی خوشی سے چہچہاتا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور بھی ہو گیا تھا۔

ایک شام بہزاد بھائی نے پنجرے کا دروازہ کھولا تو میاں مٹھو کو مُردہ پایا۔ انہیں شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ آبدیدہ ہو گئے، پھر جیسے ہی انہوں نے لاش کی طرف ہاتھ بڑھایا طوطا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''اوہ! یہ محض میرا وہم تھا۔ پیارے مٹھو! تم سلامت رہو!'' اُن کے دل سے دُعا نکلی۔

کچھ دنوں سے بہزاد بھائی بے چین سے دکھائی دیتے تھے۔ وہ صحن میں اِدھر اُدھر ٹہلتے رہتے، پھر کچھ سوچتے ہوئے پنجرے کے گرد منڈلاتے۔ میاں مٹھو کو پچکارتے مگر وہ منہ بسورے بیٹھا رہتا۔ اماں اور بابا ان کی حالت دیکھتے اور ایک دوسرے کو چپ رہنے کا اشارہ کرتے۔ تب ایک صبح بہزاد بھائی بھاگتے ہوئے آئے۔

''میں نے میاں مٹھو کو آزاد کر دیا! ہاں میں نے اسے اُڑا دیا۔'' وہ پُرجوش لہجے میں بولے۔ ''پرندے اُڑنے میں ہی خوش رہتے ہیں۔ میرا دوست بھی بے حد مسرور تھا۔ اس نے فضا میں ایک لمبا چکر لگایا۔ وہ دوسرے پرندوں سے مل رہا تھا۔ پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دیکھیے! میں بالکل بھی افسردہ نہیں ہوں۔''

بہزاد بھائی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مگر آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ ☆☆☆

نیک سیرت انسان

ایک ملک کا بادشاہ نہایت رحم دل، بہادر اور انصاف پسند تھا۔ اس کی رحم دلی کی وجہ سے رعایا اپنے بادشاہ سے بے حد خوش تھی۔ بادشاہ کا ایک خادم تھا جو بڑا ہی ذہین اور سمجھ دار تھا۔ اس کا نام ایاز تھا۔ بادشاہ اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ ایاز کو بھی اپنے آقا کی خوشی دل و جان سے عزیز تھی اور وہ ہر وقت بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ ایاز کی اس قدر و منزلت کی وجہ سے دربار کے دوسرے خادم دل ہی دل میں کڑھتے رہتے تھے۔ ایاز کی عادت تھی کہ وہ کچھ دیر کے لیے روزانہ اپنے کمرے میں جاتا اور دروازہ بند کر لیتا تھا۔ اس دوران کسی کو بھی اندر نہ آنے دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ تیار ہو کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ اس کے دوسرے ساتھی اس کی اس حرکت پر بڑے حیران تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایاز کسی دوسری حکومت کا جاسوس نہ ہو اور وہ کمرہ بند کر کے راز کی باتیں لکھتا رہتا ہو۔ وہ ایاز سے حسد تو کرتے ہی تھے، چناں چہ موقع ملتے ہی انہوں نے بادشاہ سے اس کی اس حرکت کا ذکر کیا۔ بس پھر کیا تھا، یہ بات سنتے ہی بادشاہ نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ فوراً ایاز کے کمرے کی تلاشی لیں اور وہاں جو کچھ بھی ملے، میرے سامنے حاضر کرو۔ سپاہیوں نے کمرہ کھلوایا، وہاں انہیں صرف ایک صندوق ملا جسے تالا لگا ہوا تھا۔ سپاہی وہ صندوق اٹھا لائے اور بادشاہ کے حضور پیش کر دیا۔ ایاز کی ایک نہ سنی گئی اور تالا کھلوایا گیا۔ اندر کیا تھا، صرف ایک گٹھڑی جس میں پھٹے پُرانے اور پیوند لگے کپڑوں کا صرف ایک جوڑا برآمد ہوا۔

بادشاہ، امیر، وزیر اور سارے درباری یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ کیا ہے؟ بادشاہ غصے سے ایاز سے بولا۔ ایاز پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا، ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ ''بادشاہ سلامت! میری خطا معاف کیجیے، یہ وہی لباس ہے جسے میں آپ کے حضور دربار میں آنے سے پہلے پہنا کرتا تھا۔ آپ کی مہربانی اور لطف و کرم سے آج مجھے ہر طرح کا آرام اور اچھے سے اچھا لباس میسر ہے مگر حضور میں نہیں چاہتا کہ عیش و آرام کی زندگی میں اپنی پہلی حالت کو بھول جاؤں اور یوں میرے اندر کسی قسم کا غرور یا گھمنڈ پیدا ہو جائے۔ اس لیے میرا معمول ہے کہ درباری لباس پہننے سے پہلے میں اپنے کمرے میں جا کر روزانہ یہ پُرانا لباس پہنتا ہوں اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر جہاں میں اپنی پہلی حالت یاد کرتا ہوں، وہاں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ کی مہربانیوں کا شکر بھی ادا کرتا ہوں۔'' اس بادشاہ کا نام محمود غزنوی تھا۔ بادشاہ ایاز کی اس بات پر بہت خوش ہوا اور مزید ترقی عطا کرتے ہوئے بہت سے انعام و اکرام سے بھی نوازا۔ دیکھا بچو! جو اپنے ماضی کو یاد رکھتا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا ہے، وہ ہمیشہ کام یاب رہتا ہے اور دُنیا کی کوئی طاقت اسے ناکام نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسا انسان بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(محمد صدیق قیوم، کھڈیاں)

''السلام علیکم، امی جان!'' حسن اور حسین نے اسکول سے واپس آ کر مشترکہ آواز میں خوب جوش وخروش سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! جیتے رہو، خوش رہو!'' امی نے باورچی خانے سے انہیں جواب دیا۔

''جلدی سے آ جاؤ، کھانا تیار ہے۔ بس روٹی بنا رہی ہوں۔'' امی نے دونوں کو منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھانے کے لیے آنے کی ہدایت کی۔

اپنے بستے مقررہ جگہ پر رکھتے اور جوتے شو ریک میں چھوڑ کر وہ دونوں ہاتھ دھونے چل دیئے۔ آخر پیٹ میں چوہے جو دوڑ رہے تھے۔

''امی! یہ آج کیا پکا ہے؟'' میز پر بیٹھ کر دونوں نے سالن کے اوپر سجے دھنیے کو غور سے دیکھا اور پوچھا۔

''آلو گوشت...... مزیدار اور لذیذ!'' امی خوب بشاشت سے بولیں۔

''اونہوں...... آج پھر آلو گوشت اور ساتھ کھیرے اور ٹماٹر سلاد کے نام پر۔ امی! آپ بھی علی کی امی کی طرح پیزا، سینڈوچ، برگر، بریانی، روسٹ اور شوارما بنایا کریں ناں۔'' حسن میاں منہ بنا کر بولے۔

''بیٹے کھانے کے وقت میں کھانا پکتا ہے۔ یہ سب فضولیات نہیں۔'' امی نے جواب دیا۔

''امی! میرے سب دوست اسکول بھی یہی لے کر آتے ہیں۔ بے شک آپ حسین بھیا سے پوچھ لیں۔ آج ان کے دوست اور کلاس فیلو کی سالگرہ تھی، وہ بڑا سا کیک اور بہت سے برگر لایا تھا۔ سب بچے لنچ میں پیپسی پیتے ہیں اور رول، نگٹس، پیزا اور برگر کھاتے ہیں۔ آپ ہی ہمیں اسکول میں بھی پراٹھے، انڈے اور گھر میں آلو، گوشت، سلاد اور پھل کھلاتی ہیں۔'' حسن نے اس ناراضگی میں بھائی کو بھی شامل کر لیا جو اب دسویں جماعت میں آ گیا تھا۔

''بیٹے، کبھی کبھار کے لیے تو یہ چیزیں ٹھیک ہیں مگر روزانہ ایسی چیزیں کھانا تو صحت مند عادت نہیں ہے۔ آپ بیمار ہو جاؤ گے اور پھر یہ پڑھائی کون کرے گا اور اسپورٹس میں اوّل کون آئے گا۔'' امی جان پیار سے بولیں۔

''امی! میرے کلاس فیلوز ہر روز باہر کی یہی چیزیں کھاتے ہیں، مگر بیمار نہیں ہوتے۔ خوب صحت مند ہیں۔'' اب حسین احمد بھی چھوٹے بھائی کی حمایت میں بولے۔

''بیٹا! بہت بُری بات...... کھانا سامنے رکھا ہے اور تم دونوں اسی کی بُرائیاں کر رہے ہو۔ اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں۔ چلو بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرو۔'' اب وہ خاصی سنجیدگی سے بولیں تو دونوں بیٹے منہ بنا کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سالن میں سے اُٹھتی مزے دار خوشبو اور تازی پکی ہوئی روٹیوں نے ان کی بھوک اور چمکا دی تھی۔ کھانا واقعی مزے دار تھا۔

''بیٹا! یہ تو میرے لیے بھی بہت آسان ہے کہ تم دونوں کو باہر سے یہ سب چیزیں منگوا کر دے دوں، مگر یہ بتاؤ کہ باہر یہ ٹھیلے یا ہوٹل والے صفائی کا کتنا خیال رکھتے ہوں گے۔ بھلا گھر سے زیادہ صاف اور تازہ کھانا کہاں بن سکتا ہے؟'' امی نے دونوں کو سمجھایا۔

''پھر آپ ہی ہمیں یہ سب چیزیں بنا دیا کریں۔'' حسن اور حسین دونوں ہی بولے۔

''بیٹے، ہر جگہ کے کھانے وہاں کے موسم اور ضرورت کے مطابق صدیوں کے تجربات کے بعد رواج پاتے ہیں۔ ہمارے ہاں سال کے بیشتر حصے میں گرمی پڑتی ہے۔ اس لیے یہاں نرم، زود ہضم اور ہلکی غذاؤں کا رواج اور ضرورت ہے۔ اسی لیے میں یہ شوربے والے سالن اور سلاد، رائتہ اور پھل کا اہتمام کرتی ہوں۔ یہ روز روز کے تکے، کباب، برگر، شوارمے، پیزے اور کولڈ ڈرنکس ہماری ضرورت کو پورا نہیں کرتے۔ بس زبان کا چسکا ہیں۔ ہفتے میں ایک دو بار انہیں کھا لینا اور بات ہے مگر روزانہ ان کا استعمال ہمارے جسم کے لیے بے حد نقصان دہ ہے۔ اپنے دوستوں کے وزن کا تم دونوں خود ہی مذاق اُڑاتے ہو۔ انہی چیزوں سے موٹاپا آتا ہے اور چستی کم ہو جاتی ہے۔'' امی نے اب خاصا تفصیلی جواب دیا تھا۔

''ہاں! یہ تو سچ ہے کہ ہفتے میں دو بار تو ہم یہ سب کھاتے ہیں۔ بہرحال آپ تو ناراض ہو گئیں۔ ہم تو صرف اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں ناں سب کچھ کہہ دو۔'' اب حسن نے امی کو منانے کی کوششیں کی۔

''بیٹا! یہ سب چیزیں اللہ کی نعمتیں ہیں۔ ہمارے رب کے تحفے ہیں۔ یہ طرح طرح کے کھانے، پھل سبزیاں ان کے الگ الگ ذائقے، بھلا ان کی بُرائیاں کرنے اور نقص نکالنے کی ہمیں کیا اجازت؟ ہر بات کہنے کی نہیں ہوتی۔ تمہاری ماں سارا دن تمہارے لیے کھانا بناتی ہے اور تم آتے ہی اس کا دل دکھا دیتے ہو۔ اس طرح سے سب کچھ کہنا درست نہیں۔'' دادا جان جو مسجد سے نماز پڑھ کر لوٹے تھے، بچوں کی بات سن کر جواب دینے لگے۔ وہ دونوں لڑکوں کے روز کے نخروں سے بخوبی آگاہ تھے۔

''السلام علیکم، دادا جان!'' دونوں بھائیوں نے دادا کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ و برکاتہ.....'' دادا جان نے پیار سے جواب دیا۔ وہ بغور دونوں بھائیوں کو بے دلی سے کھانا کھاتے دیکھ رہے تھے۔ اب کھانے کے بعد دونوں نے پھل کھانے شروع کر دیئے تھے۔

حسن اور حسین تم دونوں کے نام ہم نے اپنے پیارے نبی ﷺ کے نواسوں کے ناموں کی نسبت پر رکھے تھے۔ ان نواسوں سے نسبت پر جو جنت کے نوجوانوں کے سردار ہوں گے اور آپ دونوں نے اسلامیات میں پڑھا ہو گا کہ جب ہمارے پیارے نبیؐ غزوۂ خندق کے موقع پر، خندق کھود رہے تھے تو خوب گرمی تھی اور پیاس اور فاقے کا عالم تھا۔ چند صحابہ حضورؐ کے پاس تشریف لائے اور انہیں اپنے پیٹ سے بندھے پتھر دکھائے اور جانتے ہو ہمارے پیارے نبی پاکؐ نے اپنے پیٹ سے کپڑا ہٹایا تو انہوں نے دو پتھر وہاں باندھ رکھے تھے۔

ہمارے پیارے نبیؐ نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ بھوک ختم ہونے سے پہلے آپؐ کھانا ختم کر دیتے۔ جو کچھ آپؐ کے سامنے پیش کیا جاتا آپؐ تناول فرما لیتے اور جانتے ہو اس محسنِ انسانیت کا کھانا کیا تھا؟ چند کھجوریں اور بکریوں کا دودھ۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کئی کئی روز آپؐ کے گھر چولہا نہ جلتا تھا۔ ہمارے پیغمبرؐ جن کے لیے یہ کائنات بنائی گئی انہوں نے تو کبھی شکوہ نہیں کیا کہ مجھے دُنیا کی نعمتیں روز روز اور بے تحاشا کیوں نہیں ملتیں؟ یہ جو تم دونوں روز روز اس رزق کی ناشکری کرتے ہو، ڈرو اس وقت سے جب اسی رزق کو تمہارے لیے کم کر دیا جائے۔'' دادا جان نے پوتوں کو سمجھایا۔

''جی دادا جان! جیسے پچھلے دنوں میرا دوست رافع بیمار ہو گیا تھا تو ڈاکٹر نے ہر باہر کی چیز پر پابندی لگا دی تھی۔ وہ صرف کھچڑی اور دلیہ کھا سکتا تھا۔'' حسن کو فوراً اپنا دوست یاد آ گیا۔ حسین نے بھی دادا جان کی بات سن کر سر ہلایا۔ وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ ہر بات کو ہر جگہ نہیں کہہ دیا جاتا۔ سب کچھ کہہ دو سے اللہ بھی ناراض ہو سکتا ہے اور امی کا دل بھی خفا ہو سکتا ہے۔

کھانا ختم ہو چکا تھا۔ امی نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے۔

الحمد للہ الذی اطعمنا و سقانا و جعلنا من المسلمین۔

حسن اور حسین دونوں نے بھی دعا مانگی۔ انہیں آج سمجھ میں آ گیا تھا کہ ہر وقت کھانے پر تبصرہ کرنا اور نقص نکالنا درست نہیں۔ چند ہی روز بعد اسکول میں ہونے والے اسپورٹس ڈے پر دوڑوں کے مقابلوں میں دونوں بھائیوں نے اوّل انعام حاصل کیا۔ اپنی اپنی ٹرافیاں اُٹھائے وہ گھر کی طرف رواں دواں تھے اور دل ہی دل میں امی اور دادا جان کے شکر گزار تھے جنہوں نے انہیں درست راستے اور کھانے پینے کی اچھی عادتوں کی طرف راغب کیا تھا۔ بھلا اس صحت اور تندرستی کی شاہراہ کا اختتام کامیابی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ کیوں، پیارے بچو! کیا خیال ہے؟

☆☆☆

درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ نشانِ حیدر اب تک کتنے لوگوں کو دیا گیا ہے؟

i۔ 11　　ii۔ 12　　iii۔ 13

2۔ سب سے پہلے نشانِ حیدر کسے دیا گیا؟

i۔ میجر طفیل محمد شہید　　ii۔ کیپٹن محمد سرور شہید　　iii۔ میجر عزیز بھٹی شہید

3۔ جست اور تانبے کی دھات کو ملانے سے کون سی دھات بنے گی؟

i۔ تانبا　　ii۔ کانسی　　iii۔ پیتل

4۔ "رب زدنی علما" نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کی دعا ہے۔ یہ قرآن پاک کی کس سورۃ میں ہے؟

i۔ سورہ الصف　　ii۔ سورۃ البقرہ　　iii۔ سورۃ طٰہٰ

5۔ پاکستان کے شہر گوجرانوالہ کا پرانا نام کیا ہے؟

i۔ خان گڑھ　　ii۔ خان پور　　iii۔ گجر پورہ

6۔ یہ شعر بالِ جبریل سے لیا گیا ہے، مکمل کیجیے:

جوانوں کو میری آہِ سحر دے ....

7۔ چچا چھکن کا کردار کس ادیب نے تخلیق کیا ہے؟

i۔ ڈپٹی نذیر احمد　　ii۔ شوکت علی تھانوی　　iii۔ امتیاز علی تاج

8۔ لفظ شطرنج کس زبان کا لفظ ہے؟

i۔ روسی　　ii۔ فارسی　　iii۔ ہندی

9۔ اسرائیل کس پیغمبر کا لقب ہے؟

i۔ حضرت موسیٰ　　ii۔ حضرت یعقوبؑ　　iii۔ حضرت ادریسؑ

10۔ سکندرِ اعظم نے کس شہر میں وفات پائی؟

i۔ بیروت　　ii۔ مشہد　　iii۔ بابل

جوابات علمی آزمائش اگست 2016ء

1- الف　2- سیال کوٹ　3- دریائے گورنگ　4- 30 ستمبر 1947ء
5- 9 جولائی 1956ء　6- 1 سال　7- 1951ء　8- پروفیسر محمد انور
9- 1 منٹ 10 سیکنڈ　10- فرانس

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

☆ عائشہ شہزاد، لاہور　　(150 روپے کی کتب)

☆ ردا فاطمہ فریال، راول پنڈی　　(100 روپے کی کتب)

☆ آمنہ عاصم، گوجرانوالہ　　(90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: مشعال آصف، لاہور۔ محمد قمر الزماں صائم، خوشاب۔ محمد حفیظ، ڈیرہ غازی خان۔ پاکیزہ جاوید، فیصل آباد۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ محمد اسد، کراچی۔ احمد عبداللہ، ملتان۔ محمد احمد خان، بہاول پور۔ ثمران شاہد، گوجرانوالہ۔ مریم منیر، چونیاں۔ مرزا احسن، فیصل آباد۔ رانیم سلطان، جہلم۔ عبدالرحمن، لاہور۔ مسز محمد اکرم صدیقی، شمائلہ ناز، محمد ضیاء اللہ، میانوالی۔ ماہ نور، میرپور، آزاد کشمیر۔ عدن سجاد، جھنگ۔ علینا اختر، کراچی۔ رفیق احمد ناز، ڈیرہ غازی خان۔ خدیجہ گل سید، چارسدہ۔ میرب شبیر، کراچی۔ محمد منیب ستار، سیال کوٹ۔ ایاز احمد، لاہور۔ محمد بلال صدیقی، کراچی۔ مہر صدیق قیوم، قصور۔ آمنہ اختر، راول پنڈی۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ ثوبیہ آصف، لاہور۔ شہریار کفیل، گوجرانوالہ۔ محمد سجاد برکی، پشاور۔ بشریٰ حسینی، کلورکوٹ۔ زینب فاطمہ عباسی، پشاور۔ ملک محمد احسن، راول پنڈی۔ ملک منظر حسن، فتح جنگ۔ عبداللہ آصف، اسلام آباد۔ ثمن رؤف، لاہور۔ فرحین علی خان، صوابی۔ محمد زبیر کمال، لاہور۔ جویریہ آصف، محمد عثمان آصف، اسلام آباد۔ محمد عبداللہ ثاقب، پشاور۔ عبدالسلام، صوابی۔ محمد تیمور علی، لاہور۔ ارسلان راشد، ملتان۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ۔ تسلیم اختر، لاہور۔ ناظم حسین، کراچی۔ نور فاطمہ، سیال کوٹ۔ عائشہ مجید، ملتان۔ تنویر فاطمہ، گجرات۔ احمد علی، کوئٹہ۔ رقیہ ناز، صفیہ ناز، لاہور۔ انور کامران، گوجرانوالہ۔ کظیمہ زاہرہ، محمد احمد، لاہور۔ تنزیلہ علی، کوئٹہ۔ ثوبیہ احمد، جھنگ۔ کامران علی، نوشہرہ۔ تانیا حریم، سرگودھا۔ سلمان توقیر، شیخوپورہ۔ جاذب حسین، کوٹری۔ طلحہ مختار، پشاور۔ خالد اسلام، حاصل پور۔ ثمین فاطمہ، ساہی وال۔ ظلال خان، اوکاڑہ۔ شاہ زیب، میانوالی۔ سلیم رضا، سیالکوٹ۔ ساجدہ ناز، ملتان۔ در فاطمہ، کراچی۔ عبدالمقیت، لاہور۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

عبدالستار ایدھی
ایک متحرک فرشتہ

غلام حسین میمن

ہمارے ہیرو

ایک بار اسکول میں عبدالستار کا جھگڑا ہو گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ کچھ شریر لڑکے ایک ذہنی معذور بچے کو تنگ کر رہے تھے۔ بچہ خوف کے مارے اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا، مگر وہ سب اس پر ہنس کر اسے مزید خوف زدہ کر رہے تھے۔ کچھ بچے خوف ناک چہرے بنا رہے تھے۔ یہ سارا منظر اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے ان شریر بچوں کو اس عمل سے روکنے کی کوشش کی، مگر ان بچوں نے بجائے بات ماننے کے عبدالستار سے الجھنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً دھینگا مشتی ہوئی اور عبدالستار زخمی ہو گیا، مگر اسے اپنے زخم سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ وہ ذہنی معذور بچہ ان کی شرارتوں سے محفوظ ہو کر اب پُرسکون لگ رہا تھا۔

زخمی عبدالستار گھر پہنچا تو ماں کی تربیت کا ایک اور انداز اس نے دیکھا۔ ماں نے اس کے زخموں کو بڑی محبت سے دھویا اور اسے شاباش دیتے ہوئے کہا۔ ''آج تم نے ایک ایسے انسان کو زبان دی ہے جسے خوف کے باعث نہ جانے کب سے چپ لگی ہوئی تھی۔ اسے ستانے والے بچوں کو بڑے ہو کر خود ہی سمجھ آ جائے گی۔'' ماں کی ان باتوں کو اس نے ہمیشہ یاد رکھا۔

ایک روز ماں نے اسے اسکول جاتے وقت دو پیسے اس تاکید کے ساتھ دیئے کہ اس میں سے ایک پیسہ لازماً کسی ضرورت مند کو دینا، لیکن اسے دینے سے پہلے اس بات کا یقین کر لینا کہ وہ حق دار ہے کہ نہیں۔ جب وہ اسکول سے گھر آیا اور ابھی اس کے قدم گھر کے اندر ہی تھے کہ ماں نے فوراً پوچھا:

''تم نے پیسوں کا کیا کیا؟''

وہ بہانے تراشنے لگا تو ماں نے غصے سے کہا:

''خود غرض لوگ اپنے سوا کسی کو بھی کچھ دینا نہیں چاہتے۔'' اسے بے حد ندامت محسوس ہونے لگی۔ اسے لگا کہ اس نے ماں کا حکم نہ مان کر اچھا نہیں کیا۔ اسے ماں کی ناراضی بُری محسوس ہوئی۔ پھر ماں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو بیٹا! غریبوں کو ستانا اچھی بات نہیں۔ ان کی ہر ممکن مدد کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنے کا یہ بھی ایک راستہ ہے۔''

عبدالستار نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ اب ماں کی حکم عدولی نہیں کرے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے جیسے غریبوں کی مدد کر کے ماں کو بتاتا تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھتا۔

یہ وہ تربیت تھی جو ماں نے بچپن سے عبدالستار ایدھی کو دی تھی۔ رمضان کے مہینے میں والدہ اور دوسری میمن خواتین کھانے پینے کے چھوٹے چھوٹے پیکٹ تیار کر کے اسے دیتیں کہ وہ انہیں غریبوں میں تقسیم کر آئے۔ وہ اس کام میں ذرا بھی دیر نہ کرتا۔ عید کی صبح لفافوں میں رقم رکھ کر غریبوں میں بانٹنے کا کام بھی اسی کے سپرد ہوتا۔ ماں کو یہ یقین تھا کہ اس کا بیٹا یہ کام کر کے خود بھی بے حد سکون محسوس کرتا ہو گا۔ اب وہ اکثر محلے والوں کے چھوٹے موٹے کام بھی کرنے لگا تھا اور اسے کسی بھی قسم کی کوفت محسوس نہ ہوتی۔ اسے یقین تھا کہ ان کاموں کے بدلے میں اسے دعائیں ضرور ملتی ہوں گی۔

ان سب کاموں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل کود میں بھی بھرپور حصہ لیتا۔ سرکس، اسٹیج ڈرامہ اور گلی ڈنڈا

کے ساتھ اکثر دوڑ کا مقابلہ عبدالستار ہی جیتتا تھا۔

یہ بچپن کی باتیں عبدالستار ایدھی کی ہیں، جو متحدہ ہندوستان کے شہر گجرات، کاٹھیاوار میں جونا گڑھ کے قریب ایک گاؤں ''بانٹوا'' میں 1928ء کو پیدا ہوئے۔ پاکستان کی آزادی کے اعلان کے بعد وہاں کے غیر محفوظ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ بھی والدین کے ہمراہ 6 ستمبر 1948ء کو پاکستان آ گئے۔ اس وقت وہ بیس سال کے نوجوان تھے۔ یہاں آ کر بھی انہوں نے خدمتِ انسانیت کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ میٹھادر کراچی میں بانٹوا میمن ڈسپنسری میں رضاکار کے طور پر کام کا آغاز کیا۔ صبح وہ کپڑے کی دُکان پر کام کرتے اور شام کو ڈسپنسری میں مصروف ہو جاتے۔ رات کو جب وہ تھک ہار کر گھر پہنچتے تو شفیق ماں موجود ہوتی اور پہلا سوال یہی کرتیں کہ کھانا کھایا یا نہیں۔ وہ بتاتے کہ میں کھانا کھا چکا ہوں، مگر پھر بھی کھانا گرم کر کے لے آتیں۔ 1951ء میں انہوں نے خود ایک ڈسپنسری قائم کی۔ ڈسپنسری کو کھولنے کی ذمہ داری انہوں نے خود ہی سنبھالی ہوئی تھی اور اسے وقت پر کھولنے کے بارے میں اتنا پریشان رہتے کہ گھر جانے کے بجائے ڈسپنسری بند کر کے باہر سیمنٹ کی بنچ پر ہی سو جاتے۔

ڈسپنسری اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کی خدمت کا دائرہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک بڑھانے کے بارے میں منصوبہ بندی بھی کرتے رہتے اور کام کو بڑھانے کے بارے میں کافی غور و فکر کے بعد عملی قدم اُٹھاتے۔ اسی دوران انہوں نے نرسنگ انسٹی ٹیوٹ کا آغاز کر دیا۔ ان کا یہ کام اندھیرے میں روشنی ثابت ہوا۔ نرسنگ انسٹی ٹیوٹ کے توسط سے نرسوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہونے لگا۔ اس وقت اسپتالوں اور ڈسپنسریوں میں نرسنگ کے شعبے میں خواتین کم تھیں۔ اب نرسوں نے بھی دیگر طبی اداروں میں اپنی خدمات کا دائرہ بڑھایا۔ عبدالستار ایدھی نے قربانی کی کھالیں جمع کر کے ڈسپنسری کے اخراجات کو سہارا دیا۔

ان کے علاقے کے لوگ عبدالستار ایدھی کی ساری جدوجہد اور خلوص کو دیکھ رہے تھے۔ اب عام لوگوں کے ساتھ ساتھ دولت مند اور مخیّر (خیرات کرنے والے) لوگوں کا بھی ان پر اعتماد بڑھنے لگا اور وہ انہیں چندہ دے کر خوشی محسوس کرتے تھے۔

ان ہی دنوں ایک اور واقعے نے ان کی سوچ پر گہرا اثر ڈالا۔ ہوا یہ کہ ان کی والدہ کی طبیعت بے حد خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال لے جانا ضروری ہو گیا، مگر انہیں لے جانے کے لیے کوئی گاڑی نہ ملی۔ وہ کافی دیر تک سڑک پر کھڑے رہے۔ ماں کے انتقال کے بعد انہوں نے سوچا کہ ایسے دوسرے مریضوں کا کیا حال ہوتا ہوگا......؟ اسی سوچ کے ساتھ ایمبولینس کے خیال نے ان کو عملی کام کے لیے اُکسایا اور انہوں نے ایک پُرانی وین خرید کر اسے بطور ایمبولینس استعمال کرنا شروع کیا جسے وہ خود ہی چلاتے تھے اور مریضوں کو اسپتال پہنچاتے۔ اس پر لکھا تھا ''غریب آدمی کی وین۔''

ابھی تک ان کی ساری کوششیں میٹھادر کے علاقے تک محدود تھیں۔ 1951ء میں وبائی مرض کے پھوٹ جانے کے سبب انہیں اپنی خدمات کا دائرہ وسیع کرنے کا موقع ملا اور یوں ان کا کام پورے کراچی تک پھیلا۔ عوام کا اعتماد ان پر بڑھنے لگا اور عطیات میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ عوام کا پیسہ عوام کی خدمت کے کاموں میں ایمان داری سے خرچ ہونے لگا اور گزشتہ کل کی ایک چھوٹی سی ڈسپنسری اب ایک بڑی فاؤنڈیشن میں تبدیل ہو چکی تھی، جس کا دائرہ پورے ملک تک پھیل چکا تھا اور رفتہ رفتہ دُنیا کے دیگر ممالک تک بھی خدمات کا دائرہ بڑھنے لگا۔

انسانی خدمت کا وہ کون سا شعبہ ہے جس میں ایدھی فاؤنڈیشن نے اپنی خدمات انجام نہ دی ہوں۔ اس سفر میں انہیں اپنی بیگم بلقیس کا بھرپور ساتھ ملا۔ عبدالستار ایدھی کی شفیق ماں نے اپنے بیٹے کے دل میں انسانی خدمت کی جو شمع روشن کی تھی، اس شمع کی روشنی آج کئی نسلوں تک منتقل ہو چکی ہے اور نہ صرف ان کے بیٹے اور پوتے پوتیوں بلکہ بیٹیوں کے ساتھ ساتھ نواسے نواسیوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اور وہ سب خلوصِ دل سے انسانی خدمت کے کام میں مصروف ہیں۔

8 جولائی 2016ء کی رات خدمتِ انسانی کے اس مسیحا نے آخری سانس لی اور اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔ اگلے روز 9 جولائی 2016ء کی دوپہر چیف آف آرمی اسٹاف جنرل راحیل شریف نے ان کے جسدِ خاکی (میت) کو سلیوٹ کیا اور انہیں 21

توپوں کی سلامی دی گئی۔ ان کا جنازہ برٹش رائل آرٹلری کے طریقہ کار کے مطابق گن کیئر پر لے جایا گیا اور پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ ان کی تدفین ایدھی ولیج میں ان کی اپنی 25 سال قبل بنائی ہوئی قبر میں کی گئی۔

وہ کچھ عرصے سے گردوں کے امراض میں مبتلا تھے اور کراچی کے ادارے SIUT میں ڈاکٹر ادیب رضوی کے زیرِ نگرانی ان کی ڈائیلسس (Dialysis) ہوتی تھی۔ طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو انہوں نے کراچی کے ایک اسپتال کے جنرل وارڈ میں رہ کر علاج کرانا پسند کیا جہاں ایئر کنڈیشنڈ کی بھی سہولت نہ تھی۔ ملک کے مخیّر حضرات سمیت کئی سیاست دانوں نے انہیں اپنے ذاتی خرچ پر بیرون ملک علاج کرانے کی پیش کش کی جسے انہوں نے شکریے کے ساتھ منع کر دیا۔

عبدالستار ایدھی خدمتِ انسانیت پر اس قدر یقین رکھتے تھے کہ عین شادی والے دن بھی جب انہیں اطلاع ملی کہ ایک بچے کی حالت انتہائی خراب ہے اور اسے بروقت اسپتال نہ لے جایا گیا تو وہ مر بھی سکتا ہے، وہ اسے فوراً اسپتال لے کر گئے۔

کراچی کے ایک اخبار کے ایڈیٹر اس بات کے گواہ ہیں کہ تیس سال قبل کراچی میں زبان کے مسئلے پر ہونے والے فسادات میں آٹھ ہزار مصیبت زدہ افراد نقل مکانی کر کے آئے تھے اور بھوک سے نڈھال تھے۔ ایک سینئر وزیر کی کوششوں کے باوجود ان کے کھانے اور بچوں کے لیے دودھ کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔ شہر میں کرفیو کے باعث سناٹا تھا۔ رات گئے جب عبدالستار ایدھی کو نیند سے اُٹھا کر یہ مسئلہ بیان کیا گیا تو انہوں نے تمام لوگوں کے لیے سامان پہنچانے کے لیے دو گھنٹے کی مہلت مانگی اور اس دوران ایدھی کی ایمبولینس آتی جاتی رہیں اور تمام مسئلہ حل ہو گیا۔

ایدھی فاؤنڈیشن اور ریڈیو پاکستان کراچی کے پروگرام ''یہ بچہ کس کا ہے؟'' کے توسط سے ہزاروں بچے جو اپنے والدین سے بچھڑ گئے تھے، اپنے گھروں کو لوٹ چکے ہیں۔

عبدالستار ایدھی نے جو سفر تنہا ماں کے حکم سے شروع کیا تھا، وہ آج ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بڑی فاؤنڈیشن میں تبدیل ہو چکا ہے اور انہیں ''انسانیت کا عظیم مسیحا'' اور ''متحرک فرشتہ'' سمیت کئی ملکی اور بین الاقوامی اعزازات مل چکے ہیں جن میں نشانِ امتیاز اور فلپائن کا میگسیسے ایوارڈ سرفہرست ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر پھر بھی اپنی خدمات کی بدولت عوام کے دلوں اور دعاؤں میں زندہ ہیں۔

آج ملک بھر میں 330 ایدھی سینٹر، 1500 ایمبولینس کا بیڑا 24 گھنٹے اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ 2000ء میں گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ نے ان کی ایمبولنس سروس کو دنیا کی سب سے بڑی ایمبولینس سروس قرار دیا۔ ان کے پاس ہیلی کاپٹر اور ایئر ایمبولینس بھی ہیں۔ ڈوبنے والوں کی مدد کے لیے 35 غوطہ خور ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ کئی ایدھی ہومز قائم ہیں جہاں ہزاروں لاوارث بچے اور مرد عورتیں موجود ہیں۔ انہوں نے جانوروں کے لیے بھی پناہ گاہیں بنوائیں جہاں ان کا علاج اور خوراک کا مناسب بندوبست ہے۔

انہوں نے زندگی بھر سادگی کو نہ چھوڑا۔ ملیشیا رنگ کے دو جوڑے ان کی زندگی بھر کا اثاثہ تھے۔ انتقال کے وقت جو جوتے ان کے پیروں میں موجود تھے، وہ بیس سال قبل خریدے گئے تھے۔

اپنے لیے تو سبھی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

☆☆☆

ایک عورت بس والے کو روزانہ کاجو اور بادام کھانے کو دیتی تھی۔
بس والا: ''اماں! آپ مجھے روز یہ کیوں دیتی ہیں؟''
عورت: ''بیٹا دانت تو رہے نہیں، چوس کر پھینک دینا اچھا نہیں لگتا۔''

☆

دوسیٹوں والا ہیلی کاپٹر قبرستان میں گر کر تباہ ہو گیا۔ گورنمنٹ نے ایک سردار افسر کو تحقیقات کے لیے بھیجا۔ دو گھنٹے بعد اس نے اطلاع دی کہ 931 لاشیں مل چکی ہیں، مزید کھدائی جاری ہے۔

(عدن سجاد، جھنگ صدر)

ایک آدمی اپنی بیوی کو شادی سے پہلے کی تصویروں والی البم دکھا رہا تھا۔ ''یہ دیکھو! یہ تصویر میں نے گزشتہ سال افریقہ کے جنگلوں میں بن مانس کے ساتھ اُتروائی تھی۔''
بیوی بولی: ''مگر ان میں تم کون ہو؟''

(سائرہ حبیب، تاندلیانوالہ)

ایک بچے کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ چھٹی کے لیے کیا عذر پیش کرے۔ آخر اس نے اُستاد سے درخواست کی کہ مجھے اپنے دادا کی شادی کے لیے چھٹی چاہیے۔ اُستاد نے پوچھا: ''وہ اس عمر میں شادی کیوں کر رہے ہیں؟'' لڑکے نے کہا: ''سر! وہ تو نہیں کر رہے، میں زبردستی کروا رہا ہوں۔''

(قریشہ فاطمہ فاروقی، رحیم یار خان)

باپ مٹھائی تکیے کے نیچے رکھ کر گیا تو بچے نے مٹھائی نکال کر کھا لی اور تکیہ اپنے پیٹ پر رکھ لیا۔ کچھ دیر بعد باپ آیا تو اس نے پوچھا: ''بیٹا! مٹھائی کہاں ہے؟''
بیٹا (معصومیت سے): ''ابا جان! تکیے کے نیچے۔''

(محمد عمیس خان، ڈی جی خان)

بارش میں بھیگتا ہوا ایک طالب علم ہاسٹل میں واپس آیا تو اس کا دوست اس کی برساتی پہن کر باہر نکل رہا تھا۔ اس نے غصے سے کہا: ''تم نے میری اجازت کے بغیر میری برساتی کیوں پہنی؟''
دوسرا دوست (معصومیت سے): ''کیا تم پسند کرو گے کہ تمہارا سب سے خوب صورت سوٹ جو میں نے پہن رکھا ہے، بارش میں بھیگ کر خراب ہو جائے؟'' ☆

اُستاد (شاگرد سے): ''چیئرمین کسے کہتے ہیں؟''
شاگرد: ''جناب! کرسیاں بنانے والے کو۔'' ☆

ایک صاحب جہاز میں سوار ہونے جا رہے تھے۔ جب انہوں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا تو ائیر ہوسٹس نے انہیں کہا: ''ویٹ پلیز۔'' وہ صاحب یک دم بولے: ''سو پونڈ۔''

(حسن علی ارتضیٰ، راولپنڈی)

اُستاد (شاگرد سے): ''دستکاری کسے کہتے ہیں؟''
شاگرد: ''جو دروازے پر دستک دے، اسے دست کاری کہتے ہیں۔''
اُستاد (شاگرد سے): ''لفظ دستک کو جملے میں استعمال کرو۔''
شاگرد: ''مجھے دس تک گنتی آتی ہے۔'' ☆

ڈاکٹر (مریض سے): ''اچھی صحت کے لیے ضروری ہے کہ پھلوں کے ساتھ ان کے چھلکے بھی کھا لیے جائیں، ویسے آپ کا پسندیدہ پھل کون سا ہے؟''
مریض بولا: ''ناریل۔'' ☆

مریض: ''میں بہت خوش رہتا ہوں، نیند سکون سے آتی ہے، زندگی میں امن ہی امن ہے، ہر کام میں دل لگتا ہے، کوئی پریشانی نہیں، ایسا کیوں ہے، ڈاکٹر صاحب؟''
ڈاکٹر: ''میں آپ کی بیماری سمجھ گیا ہوں جناب! آپ کی زندگی میں وٹامن "She" کی شدید کمی ہے۔''

(رخام اعظم، لاہور)

شاگرد (اُستاد سے): ''انگلش والا اُستاد انگلش میں، اُردو والا اُردو میں، عربی والا عربی میں بات کرتے ہیں۔ آپ بھی ریاضی میں بات کیا کریں۔''
اُستاد: ''مجھ سے تین پانچ مت کرو، ورنہ چار سو بیسی نکال دوں گا۔ چلو نو دو گیارہ ہو جاؤ، ورنہ ایسا ماروں گا کہ ایک کے دو دو نظر آئیں گے۔''

☆

ایک لڑکے نے کوٹ پہنا ہوا تھا جس کے پیچھے کتے کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ راستے میں ایک شخص نے پیچھے سے اسے آواز دے کر کہا: ''اوئے، لڑکے تیرے پیچھے کتا چلا آ رہا ہے۔'' لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا: ''آپ کی آواز سن کر ہی پتا چل گیا تھا۔''

(بشریٰ مبین، کلورکوٹ)

عید کی شرارتیں

(شاہ بہرام انصاری، ملتان)

جب سے گھر میں بکرا لانے کا اعلان ہوا تھا، حسیب میاں بے چارگی کی تصویر بنے جل بھن رہے تھے۔ خیالی بکرے کا بھوت ان کے سر پر اس طرح سوار ہوا تھا کہ اُترنے کا نام نہ لے رہا تھا، جیسے چھوٹے سے بچے کو اس کا من پسند کھلونا اپنے پیچھے لگائے پھرتا ہو۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ بکرا ان کا من پسند نہیں بلکہ جانی دشمن تھا۔ ابھی چھوٹی عید گزری تھی کہ گھر کے بارہ تیرہ عدد بچوں نے ”بکرا چاہیے، بکرا چاہیے۔“ کی رٹ لگا دی۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کی یہ بڑی خرابی ہے کہ جوں ہی ایک بچے نے کسی شے کی فرمائش کی، باقی سب مان نہ مان میں تیرا مہمان کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ یہی نقص حسیب میاں کے گھرانے میں تھا۔ ایک تو بذاتِ خود ان کے اپنے ساتھ فیملی ممبرز اور پھر تایا، چچاؤں اور پھوپھیوں کی اولاد الگ......

قطع نظر اس پس منظر کے، آیئے! اصل عنوان پر بات کرتے ہیں۔ والدین پہلے تو بچوں کو یہ کہہ کر تسلی کروا دیتے کہ اچھا ابھی عید آنے میں کافی وقت پڑا ہے، لے آئیں گے بکرا لیکن جب آفت کے پرکالوں کو کوئی حوصلہ بخش جوابی کارروائی نظر نہ آئی تو انہوں نے بڑوں کا جینا محال کر دیا۔ شام کو وہ کام سے تھکے ہارے لوٹتے تو سب ان کو گھیرے میں لے لیتے۔ آخر تنگ آ کر تایا جان نے چند افراد سے مشورہ کر کے بکرا لانے کی بشارت دے دی۔ تمام بچے یہ بشارت سن کر ”تایا جئیں ہزاروں سال، ہم لائیں گے بکرا لال“ کا نعرہ لگاتے ہوئے خوشیاں منانے لگے۔ حسیب خوش ہونے کی بجائے آنسو بہا رہا تھا کیوں کہ اسے بکرا نامی مخلوق سے بہت ڈر لگتا تھا۔ بکرے کے بھاری بھرکم وجود کا خیال ذہن سے چکراتے ہی اسے اپنے آگے موت دکھائی دینے لگتی۔ ایسا اس کے ساتھ بچپن سے نہیں تھا بلکہ یہ کچھ عرصہ پہلے رونما ہونے والے واقعے کی وجہ سے تھا۔ ان دنوں نٹ کھٹ حسیب بہت ہنس مکھ اور ہر وقت شرارتیں کرنے والا تھا۔

حسبِ سابق اس عید الاضحیٰ کے آنے پہ بھی ان کے گھر میں ایک عدد بکرے کا اضافہ ہو گیا۔ سب کے ساتھ حسیب بھی بکرے کی آمد پر خوش لگ رہا تھا اور اس کی ایک ایک ادا پہ واری واری جا رہا تھا۔ بکرے جی کے تو مزاج ہی بدل گئے۔ حسیب میاں بکرے جی کی خدمت میں سرفہرست تھے۔ حسیب کے کزن کاشف اور عمیر بڑے شرارتی تھے۔ بکرے کو دیکھ کر دونوں نے ایک دوسرے کو آنکھوں سے اشارے کرنا شروع کر دیئے جو اس بات کی پیش گوئی تھے کہ کوئی نئی کھچڑی پکنے والی ہے۔ باقی سب بکرے کے نازنخرے اُٹھانے میں لگے تھے مگر وہ دونوں کوئی اور پلان بنانے میں مگن تھے۔ انہوں نے مل کر بکرے کی دُم پہ رسّی باندھ کر اسے تنگ کرنے کی پلاننگ کی تھی۔ اس شیطانی فعل کا سوچ سوچ کر ان کے من میں لڈو پھوٹ رہے تھے کہ اس طرح بکرا ان کے ہتھے چڑھ جائے گا۔ دونوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکمت عملی وضع کر لی۔

رات کو گھر والے اپنے کمروں میں بیٹھے تھے اور بکرا برآمدے میں بندھا ہوا تھا۔ کاشف نے جا کر چپکے سے بکرے کی ہلتی ہوئی دُم پکڑی اور آنکھ جھپکنے سے پہلے اس پر رسّی سے گرہ باندھ دی اور رسّی اپنے ہاتھ میں پکڑ کر بکرے کو اِدھر اُدھر کھینچنے لگا۔ عمیر آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے نگرانی کر رہا تھا کہ کہیں کوئی آ نہ جائے۔ بکرا اپنی دُم کو ان دونوں شیطانوں کے چنگل سے بچانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران حسیب میاں کسی ضروری کام کی غرض سے کمرے سے باہر آ گئے۔ وہ اپنے دھیان میں جوں ہی بکرے کے پاس سے گزرے تو بکرے جی نے حسیب کو ایک زوردار ٹکر رسید کر دی۔ وہ اس عزت افزائی پر بوکھلا گیا اور دھڑام سے زمین پر گرا۔ اس کا سر وہاں جانوروں کو باندھنے کے لیے رکھے گئے لوہے کی زنجیر سے لگا تو تھوڑا سا خون

بہہ گیا۔ کاشف یہ دیکھ کر گھبرا گیا اور اس نے فوراً ہاتھ میں پکڑی رسّی چھوڑ دی۔ عمیر پہلے ہی دُم دبا کر بھاگ گیا تھا۔ بکرے جی کو جیسے ہی شیطان کی ٹولی سے آزادی ملی، وہ بپھرتے ہوئے اودھم مچانے لگے۔ برآمدے کے شوکیس میں جتنے برتن رکھے تھے، تمام بکرے جی نے توڑ کر رکھ دیئے اور چند لمحوں میں برآمدہ معرکہ گاہ کا منظر پیش کرنے لگا۔ اس دھنا دھن سے چوکنا ہو کر کاشف کی بڑی بہن سائرہ کمرے سے برآمد ہوئیں۔ اس نے اپنے تحفے میں ملے ہوئے کانچ کے ڈنر سیٹ کے ٹکڑے دیکھے تو تیخ پا ہو گئی اور کاشف کو کچا چبا جانے کے انداز میں اس کی طرف لپکی۔ سائرہ نے للکارتے ہوئے بے لحاظی کی انتہا کر دی اور اس کی اچھی خاصی پٹائی کر دی۔ بس نہیں، اس کے علاوہ تایا جان سے اس کی جو الگ ٹھکائی ہوئی، اسے دیکھ کر عمیر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ بھی کاشف کے ساتھ اس جرم میں برابر کا شریک تھا، سو اس کی بھی ڈنڈوں سے خوب خاطر تواضع ہوئی۔

اس دردناک واقعے کے بعد حسیب جانوروں سے خوف زدہ اور سہا سہا رہنے لگا۔ ایک دن حسیب بسکٹ کھاتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا۔ بکرے نے میٹھے کی خوشبو سونگھ کر بسکٹ کے پیکٹ کی طرف ناک بڑھائی۔ حسیب پہلے تو پیچھے ہٹ گیا لیکن جب اس نے اپنا بازو بکرے کی طرف بڑھایا تو اس نے اسے کچھ نہ کہا بلکہ ”میں میں“ کی آوازیں نکالتے ہوئے بسکٹ کو تکنے لگا۔ حسیب کا ڈر و خوف بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے بکرے کو ڈھیروں بسکٹ، مکئی اور اسی طرح کی دوسری چیزیں کھلائیں۔ پھر اسے ساتھ لے کر شہر کی سیر بھی کرائی۔ عمیر، کاشف اور سائرہ سمیت سب اہلِ خانہ اس انہونی پر متعجب زدہ تھے۔ کہاں جانوروں کے نام سے دُور بھاگنے والا ڈرپوک حسیب اور کہاں یہ بکرا دوست...... حسیب میاں کی اپنے تمام ساتھیوں سے گزارش ہے کہ اگر وہ بکروں سے ڈرتے ہیں تو اس پریشانی کو دماغ سے نکال دیں۔ بکرے کو ایک پیار بھری نگاہ سے دیکھیں گے تو وہ انہیں کچھ نہیں کہے گا بلکہ ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دے گا اور انہیں ایک پیارا سا ساتھی مل جائے گا۔

(پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

گوشت

(محمد رمیز بٹ، لاہور)

”ارے احمد کے ابا! اس بار بقر عید پر کیا دلا رہے ہو؟“ شائستہ بیگم نے اکرم صاحب سے پوچھا۔ ”مگر بیگم! تم نے میٹھی عید کی طرح اس عید پر بھی تین عدد جوڑے اور میچنگ کی ہر چیز لے لی ہے۔ اب کیا جان لو گی میری؟“ اکرم صاحب منہ بناتے ہوئے بولے۔ ”اوہو! آپ تو بس میری شاپنگ کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ میں قربانی کے جانور کی بات کر رہی ہوں۔“ شائستہ بیگم چڑ کر بولیں۔ ”بیگم جانور تو اس سال نہیں آ سکے گا۔ میں قریبی مسجد میں حصہ ڈالنے کا سوچ رہا ہوں۔ ویسے بھی جانوروں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔“ اکرم صاحب بولے۔ ”کیا کہا؟ حصہ ڈالیں گے! ارے حصے کا گوشت ہوتا ہی کتنا ہے۔ آپ میری ایک بات کان کھول کر سن لیں۔ اس بار ہمارے گھر ایک موٹا تازہ بیل ہی آئے گا۔“ شائستہ بیگم بولیں۔ ”اچھا بیگم، تم جیتی میں ہارا۔ ہم اس عید پر بیل ہی ذبح کریں گے۔“

بقر عید سے پورے دو دن پہلے اکرم صاحب ایک موٹا تازہ لیکن بوڑھا سا بیل لے آئے۔ بقر عید کے دن نماز کے بعد اکرم صاحب نے بھی اپنا بیل ذبح کروایا اور سارا گوشت بیگم کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ شائستہ بیگم جلدی جلدی سارا گوشت فریزر میں رکھنے لگیں۔ ”بیگم! رشتہ داروں اور محلے والوں کا حصہ تو نکال لو۔“ اکرم صاحب بولے۔ ”اُف! آپ کو تو بس ان لوگوں کی فکر رہتی ہے۔ ہمیں اتنے دنوں بعد گوشت نصیب ہوا ہے۔ ہم جی بھر کر بھی نہ کھائیں۔“ شائستہ بیگم بولیں، مگر اس دن کے بعد سے اکرم صاحب بھی بہت خوش تھے۔ جب بھی وہ دفتر سے آتے تو شائستہ بیگم ان کے لیے کبھی بریانی، کبھی قورمہ، تو کبھی نہاری بناتیں لیکن ایک دن جب وہ دفتر سے واپس آئے تو بیگم فریزر کے قریب بیٹھے رو رہی تھی۔ ”ارے بیگم! کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے؟“ اکرم صاحب بولے۔ ”نہیں، احمد کے ابا، خیریت نہیں ہے۔ صبح سے بجلی نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں برف پگھلنے سے گوشت نہ سڑ جائے۔“ بیگم بولیں۔

اکرم صاحب نے جلدی جلدی بازار سے برف لا کر فریزر میں بھری، مگر اگلے دن وہی ہوا جس کا انہیں ڈر تھا۔ برف پگھل چکی تھی اور وہ سارا گوشت جو رشتہ داروں اور غریبوں سے روک

رکھا تھا، خراب ہو گیا۔ اب شائستہ بیگم پچھتا رہی تھیں مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب......

(دوسرا انعام:175 روپے کی کتب)

چڑیا کی نصیحت

(سارا ارشد، سرگودھا)

ایک شخص نے چڑیا کو پکڑنے کے لیے جال بچھایا۔ اتفاق سے ایک چڑیا اس میں پھنس گئی اور شکاری نے اسے پکڑ لیا۔ چڑیا نے اس سے کہا: ''اے انسان! تم نے کئی ہرن، بکرے اور مرغ وغیرہ کھائے ہیں، ان چیزوں کے مقابلے میں میری کیا حقیقت۔ ذرا سا گوشت میرے جسم میں ہے، اس سے تمہارا کیا بنے گا؟ تمہارا تو پیٹ بھی نہیں بھرے گا لیکن اگر تم مجھے آزاد کر دو تو میں تمہیں تین نصیحتیں کروں گی جن پر عمل کرنا تمہارے لیے بہت مفید ہو گا۔ ان میں سے ایک نصیحت تو میں ابھی کروں گی جب کہ دوسری اس وقت جب تم مجھے چھوڑ دو گے اور میں دیوار پر جا بیٹھوں گی۔ اس کے بعد تیسری اور آخری نصیحت اس وقت کروں گی جب دیوار سے اڑ کر سامنے درخت کی شاخ پر جا بیٹھوں گی۔'' اس شخص کے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ نہ جانے چڑیا کیا نصیحتیں کرے۔ اس نے چڑیا کی بات مانتے ہوئے اس سے پوچھا: ''تم مجھے پہلی نصیحت کرو، پھر میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔'' چناں چہ چڑیا نے کہا: ''میری پہلی نصیحت یہ ہے کہ جو بات کبھی نہیں ہو سکتی، اس کا یقین مت کرنا۔'' یہ سن کر اس آدمی نے چڑیا کو چھوڑ دیا اور وہ سامنے دیوار پر جا بیٹھی، پھر بولی: ''میری دوسری نصیحت یہ ہے کہ جو بات ہو جائے، اس کا غم نہ کرنا۔'' اور پھر کہنے لگی: ''اے بھلے مانس! تم نے مجھے چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کی کیوں کہ میرے پیٹ میں پاؤ بھر کا انتہائی نایاب پتھر ہے۔ اگر تم مجھے ذبح کرتے اور میرے پیٹ سے اس موتی کو نکال لیتے تو اس کو فروخت کرنے سے تمہیں اس قدر دولت حاصل ہوتی کہ تم بہت بڑے رئیس بن جاتے۔'' اس شخص نے جو یہ بات سنی تو لگا افسوس کرنے اور پچھتایا کہ اس نے چڑیا کو چھوڑ کر اپنی زندگی کی بہت بڑی غلطی کی۔ اگر اسے نہ چھوڑتا تو اس کی زندگی سنور جاتی۔ چڑیا نے اسے اس طرح سوچ میں پڑے دیکھا تو اڑ کر درخت کی شاخ پر جا بیٹھی اور بولی: ''اے بھلے مانس! ابھی میں نے تمہیں پہلی نصیحت کی جسے تم بھول گئے کہ جو بات نہ ہو سکنے والی ہو، اس کا ہرگز یقین نہ کرنا لیکن تم نے میری اس بات کا اعتبار کر لیا کہ میں چھٹانک بھر وزن رکھنے والی چڑیا اپنے پیٹ میں پاؤ بھر وزن کا موتی رکھتی ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ میں نے تمہیں دوسری نصیحت یہ کی تھی کہ جو بات ہو جائے، اس کا غم نہ کرنا مگر تم نے دوسری نصیحت کا بھی کوئی اثر نہ لیا اور غم و افسوس میں مبتلا ہو گئے کہ خواہ مخواہ مجھے جانے دیا۔ تمہیں کوئی بھی نصیحت کرنا بالکل بے کار ہے۔ تم نے میری پہلی دو نصیحتوں پر کب عمل کیا جو تیسری پر کرو گے۔ تم نصیحت کے قابل نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے چڑیا پھر سے اُڑی اور ہوا میں پرواز کر گئی۔ وہ شخص وہیں کھڑا چڑیا کی باتوں پر غور و فکر کرتے ہوئے سوچوں میں کھو گیا۔

وہ لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جنہیں کوئی نصیحت کرنے والا ہو۔ ہم اکثر اپنے مخلص ساتھیوں اور بزرگوں کی نصیحت پر کان نہیں دھرتے اور اس میں نقصان ہمارا ہی ہوتا ہے۔ یہ نصیحتیں صرف کہنے کی باتیں نہیں ہوتی بلکہ دانائی اور دوسروں کے تجربات سے حاصل ہونے والے انمول اثاثے ہیں۔ اگر ہم ان پر عمل کریں تو یقیناً ہمارے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

(تیسرا انعام:125 روپے کی کتب)

جذبہ

(حفصہ اعجاز، صوابی)

''ہاں بھئی، کمل تم کیا لائے ہو؟'' ''سر! میں یہ چاکلیٹوں کا ایک ڈبا لایا ہوں۔'' ''شاباش بیٹا! تم بہت اچھے بچے ہو۔'' ''اور علی تم کیا لائے ہو؟'' ''سر! میں یہ دو سو روپے لایا ہوں۔'' ''جیتے رہو، بیٹا!'' ''اور فہد تم کیا لائے ہو؟''

ماسٹر صاحب ایک ایک بچے کو بلاتے اور اس سے رقم، کپڑے، کھانے پینے کی اشیاء اور دوسرے عطیات لے کر میز پر رکھتے اور بچوں کی حوصلہ افزائی کرتے۔ گزشتہ روز ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسمبلی میں اعلان کیا تھا کہ ملک بھر میں سیلاب آیا ہے جس کی وجہ سے گاؤں میں بہت سے خاندانوں کا مالی و جانی نقصان ہوا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم ان کی مدد کریں اور دوسرے اسکولوں کی طرح ہمارا اسکول بھی سیلاب زدگان کی مدد کرے۔ ''آپ سب بچے نقد رقم، کھانے پینے کی اشیاء، کپڑے اور دیگر تحائف وغیرہ دے کر ان کی مدد کر سکتے ہیں۔''

فہد بہت امیر گھرانے کا بچہ تھا لیکن اس کے اندر مدد کرنے کا ''جذبہ'' نہیں تھا۔ اس کے دل میں ہمیشہ یہ خیال آ جاتا کہ اگر میں

کسی کو کوئی چیز دوں گا تو میرے پاس چیزیں کم ہو جائیں گی، حالانکہ جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں کچھ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس سے زیادہ دیتا ہے مگر فہد ایسا نہیں کرتا تھا۔

دن یوں ہی گزرتے رہے، ایک دن ماسٹر صاحب نے انہیں مدد کرنے کے بارے میں کچھ لیکچر دیا: ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔ اس سے دلوں میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوتا ہے۔ انہوں نے غزوۂ تبوک کا ایک واقعہ بھی سنایا۔

''رسول اکرمؐ کے عہد میں غزوۂ تبوک کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ اس جنگ میں مسلمانوں کا مقابلہ قیصر روم سے تھا جو مال و دولت اور افرادی قوت میں مسلمانوں سے کہیں آگے تھا۔ اتنی بڑی قوت سے ٹکرا لینا اور اسے شکست دینا بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نبی کریمؐ نے مسلمانوں سے اس معرکے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے لیے کہا۔

صحابہؓ کرامؓ نے بھی اپنے مال و متاع کو اس غزوہ کی تیاری میں لگا دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اپنے گھر کا آدھا سامان اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے گھر کا پورا سامان اس مہم کے لیے پیش کر دیا اور بہت سی صحابیاتؓ نے اپنے سونے کے زیور بھی اس مہم کے لیے پیش کر دیے۔'' اس واقعہ کا فہد پر بہت اثر ہوا۔ بہت دنوں کے بعد اسکول میں ایک بار پھر سیلاب زدگان کے لیے تحائف جمع کیے جا رہے تھے۔

اس بار فہد نے بہت اچھے اچھے تحائف، کپڑے اور نقد رقم وغیرہ دیے تو ماسٹر صاحب بہت خوش ہوئے اور انہوں نے فہد کی حوصلہ افزائی کی اور بہت سی دعائیں دیں۔

آج فہد بہت خوش تھا کیوں کہ اس کے اندر ایک نیا ''جذبہ'' پیدا ہو گیا تھا اور یہ دن اس کے لیے ایک یادگار دن بن گیا تھا۔

''تو کیوں بچو! آپ کے اندر تو یہ ''جذبہ'' موجود ہوگا نا؟

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

علم کی شمع

(محمد اسد، کراچی)

فاخر اور عدنان دونوں ایک اسکول میں ہم جماعت تھے۔ فاخر پڑھائی کا شوقین تھا، جب کہ عدنان بوجہ مجبوری پڑھائی کر رہا تھا اور بڑی مشکل سے پاس ہوتا تھا۔ وہ ظاہر میں فاخر کا دوست تھا لیکن آستین کا سانپ تھا اور فاخر سے جلتا تھا۔ عدنان کی والدہ اسے ہمیشہ سمجھاتیں کہ بیٹا پڑھائی کرو، پڑھائی انسان کو شعور سکھاتی ہے اور علم کے بغیر انسان ترقی نہیں کر سکتا۔ ہمارے نبیؐ نے علم حاصل کرنا سب پر لازم قرار دیا ہے لیکن عدنان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وقت گزرتا گیا، فاخر نے پانچویں جماعت کے امتحان میں بورڈ میں پہلی پوزیشن لی اور اس کا وظیفہ مقرر ہو گیا۔ اب عدنان بہت پریشان ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ فاخر آگے نہ پڑھے۔ اس نے ایک طریقہ سوچا کہ فاخر کی کاپیاں غائب کر دوں تاکہ وہ پوزیشن نہ لے سکے۔ ہاف ٹائم میں فاخر کینٹین گیا تو عدنان نے فاخر کی کاپیاں نکال کر اپنے بیگ میں رکھ لیں۔ سالانہ امتحان نزدیک تھے۔ گھر جا کر فاخر نے ہوم ورک کے لیے بیگ کھولا تو کاپیاں نہیں تھیں۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ اگلے دن اس نے سب کے بیگ اسکول میں دیکھے لیکن فاخر کو کاپیاں کہیں نہیں ملیں وہ تو عدنان نے گھر لے جا کر جلا دی تھیں۔ خیر فاخر نے امتحان کی تیاری کی۔ میٹرک کے امتحان میں فاخر نے پورے اسکول میں پہلی پوزیشن لی۔ پھر کالج اور یونیورسٹی کی پڑھائی ہوئی، فاخر نے یونیورسٹی میں بھی ٹاپ کیا۔ فاخر کے گھر والے فاخر کے یونیورسٹی میں پوزیشن لینے پر بہت خوش تھے۔ عدنان بمشکل تمام نویں کلاس تک پڑھ پایا۔

دن گزرتے گئے۔ فاخر ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گیا۔ ایک دن فاخر آفس میں تھا کہ چپڑاسی نے آ کر کہا کہ صاحب کوئی بہت غریب مفلوک الحال شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ فاخر نے کہا کہ اس کو اندر بلاؤ۔ چپڑاسی اس کو اندر لے آیا۔ فاخر، عدنان کا حلیہ دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا اور اُٹھ کر اس کو گلے لگا لیا۔ عدنان بولا کہ مجھے معاف کر دیں، میں نے آپ کی پڑھائی میں بہت رکاوٹیں ڈالیں۔ میں بہت بھوکا ہوں۔ تین دن سے کھانا نہیں ملا۔ ٹین ڈبے بیچ کر گزارہ کرتا ہوں۔ غلط دوستوں نے مجھے برباد کر دیا۔ کاش! میں آپ کا اور اپنی امی کا کہنا مان لیتا تو آج میری اور میرے گھر والوں کی یہ حالت نہ ہوتی۔ فاخر نے عدنان کے لیے چپڑاسی سے کھانا اور چائے منگوائی۔ کھانا کھلایا اور دو ہزار روپے اس کو خرچ کے دیئے اور کچھ دن بعد آنے کو کہا اور اپنے آفس میں عدنان کو چوکی دار لگوا دیا۔ عدنان اب بہت خوش ہے لیکن تعلیم سے محرومی کا اس کو بہت افسوس ہے۔

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

پیارے بچو! ہمارا شمار ترقی پذیر ممالک میں ہوتا ہے جہاں لوگوں کے بہت سارے معاشی مسائل ہیں۔ اپنے ان مسائل سے نبرد آزما ہونے اور اپنے معاشی مسائل کو پورا کرنے کے لیے لوگ غیر قانونی ذرائع کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ مسائل نہ صرف ہمارے ترقی پذیر ملکوں میں ہوتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ مثلاً چوری چکاری، راہ زنی، قتل اور ڈاکہ کی وارداتیں ان ممالک میں بھی بہت زیادہ ہوتی ہیں۔

امریکہ میں ایک دفعہ کسی سائنس دان کا قتل ہوگیا۔ وجہ یہ بنی کہ اس کا ایک ماتحت اس سے اہم راز حاصل کرنا چاہتا تھا مگر وہ کام یاب نہ ہو سکا۔ دراصل اسی نے اس سائنس دان کو قتل کیا اور بعد میں کمال ہوشیاری سے خودکشی کا ڈرامہ رچا لیا۔ جب پولیس نے تفتیش کی تو اس نے ماتحت آدمی کو ہی قاتل قرار دے دیا اور چالان کر کے عدالت میں پیش کیا اور جرم ثابت ہونے پر جیل میں سزا دلوا دی۔

پیارے بچو! آپ تصویر کو ملاحظہ کر کے بتائیں کہ پولیس نے یہ کیسے ثابت کیا کہ یہ خودکشی نہیں تھی۔

پیارے بچو! اگست 2016ء کے کھوج لگائیے کا جواب یہ ہے:
منشی نے سیٹھ کے روپے چوری کر کے اپنی ٹوپی کے نیچے رکھ لیے تھے۔

1- فرید احمد، لاہور	2- حمزہ ستار، اسلام آباد
3- عبدالرحمن، لاہور	4- تحریم نور طاہر، گجرات
5- عابد حسین، اوکاڑہ	

تھیوسانگ نے بھی ماحول کا جائزہ لیا اور یہی رائے دی کہ ہمیں آدھی رات کو آنا چاہیے جب قبرستان میں کوئی انسان نہ ہو۔ وہ وہاں سے نکل کر شہر میں آ گئے۔ پھر سرائے میں آ کر رات ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جب رات آدھی گزر گئی تو کیٹی اور تھیوسانگ شہر کے دروازے میں سے گزر کر قبرستان میں آ گئے۔ قبرستان میں ڈراؤنی خاموشی اور تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ تھیوسانگ اور کیٹی نے قبر کے پتھر اکھاڑنے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد قبر سرہانے کی طرف سے کھل گئی۔ قبر کے اندھیرے میں کیٹی اور تھیوسانگ نے سفید کفن سے باہر نکلا ہوا ایک خوب صورت لڑکی کا چہرہ دیکھا جو مُردہ تھا اور جس پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ مُردہ لڑکی خوب صورت تھی۔

اس کی آنکھیں تھوڑی تھوڑی کھلی تھیں۔ تھیو سانگ نے بھی جھک کر کفن میں سے نکلا ہوا مُردہ لڑکی کا چہرہ دیکھا اور بولا۔

''اس کا تو ابھی کفن بھی میلا نہیں ہوا کیٹی!''

کیٹی کی آنکھیں مُردہ لڑکی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ کہنے لگی۔ ''تھیوسانگ! اس کو مُردہ دیکھ کر اس سے باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے تو یہ جب زندہ ہو گی تو کتنی خوب صورت ہو گی۔''

تھیوسانگ کہنے لگا۔ ''تم جذباتی ہو رہی ہو کیٹی۔ اپنی طاقت کا امتحان لو اور اگر لڑکی تم سے بات کرے تو اس سے پوچھو کہ جولی سانگ یہاں کہاں ہے اور عنبر ناگ ماریا ہمیں کہاں ملیں گے؟''

کیٹی کے لیے کسی مُردہ لاش سے بات کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ اس نے مُردہ لڑکی لوشیا کے خوب صورت مگر بے جان چہرے کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ لاش کا ماتھا برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ کیٹی نے کہا۔ ''میں کیٹی ہوں۔ مجھ سے بات کرو۔''

لاش پر سے کیٹی نے ہاتھ اُٹھا لیا۔ مُردہ لڑکی نے آہستہ سے آنکھیں پوری کھول دیں۔ اپنا چہرہ سیدھا کیا اور کیٹی کی طرف دیکھا۔ قبر کی تاریکی اور رات کے اندھیرے میں مُردہ لڑکی کا گورا چہرہ کنول کے پھول کی طرح لگ رہا تھا۔ کیٹی کے ہاتھ لگانے سے مُردہ لڑکی لوشیا میں عارضی طور پر زندگی واپس آ گئی تھی۔ اس نے کیٹی کی طرف دیکھ کر کمزور آواز میں کہا۔

''تم نے مجھے موت کی گہری نیند سے کیوں جگایا؟''

کیٹی نے بڑے فخر سے قبر کے باہر بیٹھے ہوئے تھیوسانگ کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ دیکھ لو، مجھ میں مُردوں سے بات کرنے کی طاقت آ گئی ہے۔ اب وہ اپنی دوسری طاقت آزمانا چاہتی تھی کہ کیا وہ مُردوں کی دُنیا کی سیر کر سکتی ہے؟ کیٹی نے مُردہ لڑکی لوشیا سے کہا۔ ''لوشیا! کیا تم مجھے مُردوں کی دُنیا کی سیر کرا سکتی ہو۔''

مُردہ لڑکی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا۔ ''مُردوں کی دُنیا ایک ویران دُنیا ہے۔ وہاں کی سیر کر کے تم اداس ہو جاؤ گی۔''

کیٹی نے کہا۔ ''لوشیا! میرے سوال کا جواب دو۔ کیا تم مجھے مُردوں کی دُنیا کی سیر کرا سکتی ہو؟''

مُردہ لڑکی بولی۔ ''میں تمہارے حکم کی پابند ہوں۔ اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں تمہیں قبر کے نیچے مُردوں کی دُنیا میں لے جا سکتی ہوں۔'' کیٹی بڑی خوش ہوئی۔ اس کے پاس ایک ایسی طاقت آ گئی تھی جو جولی سانگ کے پاس بھی نہیں تھی۔ جولی سانگ مُردوں سے بات ضرور کر سکتی تھی مگر وہ مُردوں کی دُنیا کی سیر نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے مُردہ لڑکی سے کہا۔

''ٹھیک ہے لوشیا! لیکن میں ابھی مُردوں کی دُنیا کی سیر نہیں کروں گی۔ پھر کبھی سہی۔ ابھی تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ میری سہیلی جولی سانگ یہاں بابل شہر میں کہاں پر ہے؟''

مُردہ لڑکی لوشیا نے آنکھیں بند کر لیں۔ دوبارہ آنکھیں کھول کر کیٹی کی طرف دیکھا اور کمزور آواز میں کہنے لگی۔

''مجھے معلوم ہے جولی سانگ کہاں ہے مگر مجھے یہ راز تمہیں بتانے کی اجازت نہیں ہے۔'' کیٹی نے حیران ہو کر قبر کے باہر بیٹھے تھیوسانگ کی طرف دیکھا اور اپنی خلائی زبان میں کہا۔ ''یہ مُردہ عورت تو جولی کے بارے میں کچھ نہیں بتا رہی، اب کیا کریں؟'' تھیوسانگ نے خلائی زبان میں جواب دیا۔

''اس سے عنبرناگ ماریا کے متعلق پوچھو۔''

کیٹی نے مُردہ لڑکی سے پوچھا۔

''کیا تم عنبرناگ ماریا کے بارے میں بتاؤ گی کہ وہ کہاں ہیں؟ کس شہر میں ہیں اور کس حال میں ہیں؟''

مُردہ لڑکی لوشیا نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک سیکنڈ بعد آنکھیں کھولی اور بولی۔ ''میں نے عنبرناگ ماریا کو دیکھ لیا ہے لیکن مجھے ان کے بارے میں تمہیں کچھ بتانے کی اجازت نہیں مل رہی۔''

کیٹی نے جھنجھلا کر کہا۔ ''یہ تم کس سے اجازت طلب کرتی ہو؟''

مُردہ لڑکی کے چہرے کا رنگ اور زیادہ سفید ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''ایسی گستاخانہ بات پھر اپنی زبان سے مت نکالنا۔ تم زندہ لوگ ہم مُردہ لوگوں کی دُنیا کے اصولوں اور ضابطوں سے واقف نہیں ہو۔ بعض باتیں بتانے کی ہمیں اجازت نہیں ہے اور ہم انہیں کبھی نہیں بتا سکتے۔ اگر کچھ اور پوچھنا ہے تو پوچھو۔ میں واپس موت کی نیند سونا چاہتی ہوں۔'' کیٹی نے کہا۔ ''جو کچھ مجھے تم سے پوچھنا تھا، پوچھ لیا۔ تم نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔ تم موت کی دُنیا میں واپس جا سکتی ہو۔''

اس کے ساتھ ہی مُردہ لڑکی کے چہرے پر ایک بار پھر مُردنی چھا گئی اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ کیٹی قبر سے باہر آ گئی۔ تھیوسانگ نے قبر کے اوپر پتھر رکھتے ہوئے کہا۔

''اس مُردہ لاش نے ہمیں نہ تو جولی سانگ کے بارے میں کچھ بتایا اور نہ عنبرناگ کی کوئی خبر دی لیکن تم امتحان میں کامیاب ہو گئی ہو۔ اب تم نہ صرف یہ کہ مُردوں سے بات چیت کر سکتی ہو بلکہ مُردوں کی دُنیا کی سیر بھی کر سکتی ہو۔''

کیٹی نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''مگر اس کا کیا فائدہ؟ جب ہمیں عنبرناگ ماریا اور جولی سانگ کی کوئی خبر نہیں مل سکی۔''

تھیوسانگ ہاتھوں پر سے مٹی جھاڑتے ہوئے بولا۔

''ناامید ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم خود اپنے دوستوں کو تلاش کر لیں گے۔ آؤ شہر کی طرف چلتے ہیں۔''

کافی دیر تک تھیوسانگ اور جولی سانگ بابل شہر کے بازاروں اور گلیوں میں چکر لگاتے رہے۔ انہیں کہیں بھی جولی سانگ کا سراغ نہ ملا۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ وہاں سے سات میل دُور شمال کی جانب جولی سانگ نجومی پانڈو کے عالی شان دریا کنارے والے محل میں رہ رہی ہے۔ اگر جولی سانگ کے جسم سے خوشبو نکل رہی ہوتی تو وہ فوراً اس کے پاس پہنچ جاتے لیکن جولی سانگ کی یادداشت گم ہونے کے بعد اس کی خوشبو بھی رُک گئی تھی۔ شام ہوتے ہی دونوں سرائے میں آ گئے۔

رات کو کیٹی نے تھیوسانگ سے کہا۔

''اس طرح تو ہم عنبرناگ ماریا اور جولی سانگ کا کچھ پتا نہیں لگا سکیں گے۔ ہم نے بابل شہر کا کونہ کونہ چھان مارا ہے، ہمیں جولی سانگ کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔''

تھیوسانگ کہنے لگا۔ کچھ روز اور دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر ناکامی ہوئی تو ہم یہاں سے ملک یونان کی طرف نکل جائیں گے۔ ہو سکتا ہے وہاں ہمارے دوستوں کا کچھ سراغ مل جائے۔''

کیٹی کے دل میں ایک نئی خواہش اُبھر رہی تھی مگر وہ

تھیوسانگ کو بتاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ جب تھیوسانگ نے کہا کہ وہ کچھ دنوں کے بعد بابل شہر سے یونان کی طرف چل دیں گے تو کیٹی نے اس کے آگے اپنے دل کی خواہش کا اظہار کر ہی دیا۔

''تھیوسانگ! میں چاہتی ہوں کہ کیوں نہ ایک بار مُردوں کی دُنیا میں جا کر اپنے دوستوں کو تلاش کر لوں؟''

تھیوسانگ نے چونک کر کیٹی کی طرف دیکھا۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

کیٹی بولی۔''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ مُردہ لڑکی لوشیا مجھے مُردہ لوگوں کی دُنیا میں لے جا سکتی ہے۔ اگر میں تھوڑی دیر کے لیے مُردوں کی دُنیا کا چکر لگا آؤں تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ اس طرح سے ممکن ہے کہ وہاں کسی ذریعے سے مجھے عنبرناگ ماریا اور جولی سانگ کا کچھ پتا چل جائے۔''

تھیوسانگ کہنے لگا۔''میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ یاد نہیں ایراوتی کی مورتی نے خبردار کیا تھا کہ مُردوں کی دُنیا میں اگر کسی مُردے نے تمہیں پسند کر لیا تو پھر تم اس دُنیا سے کبھی واپس اپنی دُنیا میں نہیں آسکو گی۔''

کیٹی نے سر جھٹک کر کہا۔

''تھیوسانگ بھائی تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا کبھی کوئی مُردہ بھی کسی پر عاشق ہوا ہے؟ ایراوتی کی مورتی نے یوں ہی مجھے ڈرانے کے لیے کہہ دیا ہوگا اور پھر ہمیں اپنے دوستوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ ہم خطرناک اور ڈراؤنے جنگلوں اور آسیبی قلعوں میں اپنے دوستوں کو تلاش کرتے رہے ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے میں مُردوں کی دُنیا میں چلی جاؤں گی تو کیا فرق پڑے گا؟''

تھیوسانگ نے کیٹی کو ہلکی سی ڈانٹ کے ساتھ کہا۔

''میں تمہیں مُردوں کی دُنیا میں جانے کی کبھی اجازت نہیں دوں گا۔ بس اس کے بعد یہ ذکر مت کرنا۔''

اور تھیوسانگ چارپائی پر چادر لے کر لیٹ گیا۔

''میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ تم اگر چاہو تو اپنی کوٹھڑی میں جا کر آرام کر سکتی ہو۔ ہاں، اندر سے کنڈی لگا لینا۔''

کیٹی خاموشی سے اُٹھ کر اپنی کوٹھڑی میں آ گئی۔ اسے تھیوسانگ سے بھائیوں کی طرح پیار تھا مگر تھیوسانگ کی ڈانٹ اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ اس کے دل میں اس ڈانٹ نے بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ پہلے تو اس کی خواہش یہی تھی، اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مُردوں کی دُنیا میں ضرور جائے گی اور وہاں جا کر عنبرناگ ماریا اور جولی سانگ کے ٹھکانوں کا سراغ لگانے کی کوشش کرے گی اور جب واپس آ کر تھیوسانگ کو بتائے گی کہ عنبرناگ ماریا اور جولی سانگ فلاں جگہ پر ہیں تو وہ حیران رہ جائے گا۔ ویسے بھی کیٹی کو بڑا شوق تھا کہ مُردوں کی دُنیا میں جا کر دیکھے کہ وہ کس قسم کی دُنیا ہے۔ مُردے وہاں کس طرح سے رہتے ہیں؟ کیا وہاں وہ زندہ ہوتے ہیں یا لاشوں کی طرح پڑے رہتے ہیں؟

اس وقت رات کے دس بجے ہوں گے۔ کیٹی کی کوٹھڑی میں چراغ جل رہا تھا۔ کیٹی آہستہ سے چارپائی پر سے اُٹھی۔ اس نے چراغ پھونک مار کر بجھا دیا اور بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ ساتھ والی کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ تھیوسانگ آرام کر رہا تھا۔ کیٹی چپکے سے سرائے سے نکل کر پرانے قبرستان کی طرف روانہ ہو گئی۔ دل میں یہی خیال تھا کہ وہ گھنٹہ دو گھنٹہ مُردوں کی دُنیا کی سیر کر کے واپس آ جائے گی اور تھیوسانگ کو پتا ہی نہیں چلے گا اور اگر اسے عنبرناگ ماریا اور جولی سانگ کا کوئی سراغ مل گیا تو وہ بڑے فخر سے آ کر تھیوسانگ کو بتائے گی کہ دیکھا میں نے آخر اپنے ساتھیوں کا نشان ڈھونڈ نکالا۔

یہی کچھ سوچتی ہوئی کیٹی قبرستان میں داخل ہو گئی۔ قبرستان میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ گہری خاموشی تھی۔ قبرستان میں سوائے خاموشی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ کیٹی لوشیا کی قبر پر آ گئی۔ اس کی قبر کا پتھر ہٹایا۔ نیچے سفید کفن میں لوشیا کی لاش کا زرد مُردہ چہرہ ایک طرف کو ڈھلکا پڑا تھا۔ وہ موت کی گہری نیند سو رہی تھی۔

کیٹی نے آہستہ سے مُردہ لوشیا کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ماتھا برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ کیٹی نے کہا۔

''اے مُردہ لوشیا! میں کیٹی ہوں۔ مجھ سے بات کر۔''

مُردہ لوشیا کی گردن سیدھی ہو گئی۔ کیٹی نے اپنا ہاتھ اوپر اُٹھایا۔ مُردہ لوشیا نے کیٹی کی طرف آنکھیں کھول کر دیکھا اور کہا۔

''پوچھو۔ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہو؟ میں تمہارے حکم کی پابند ہوں۔''

کیٹی کا دل ایک پل کے لیے دھڑکا۔ وہ مُردوں کی دُنیا میں جاتے کچھ گھبرانے لگی۔ (بقیہ آئندہ) ☆☆☆

مدیرہ تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

اس مرتبہ رسالہ 30 جولائی کو ہی مل گیا۔ سرورق دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ میں پانچ سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں اور دو سال سے اس میں لکھ کر شرکت بھی کر رہی ہوں، مگر مجھے آپ سے ایک شکایت ہے۔ میں ہر ماہ خط بھیجتی ہوں مگر کبھی شائع نہیں ہوتا۔ آپی پلیز! میرا خط اس بار شائع کر دیں۔ پورا نہ سہی، آدھا ہی شائع کر دیں، ورنہ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔ (حرا سعید، جوہر آباد)

☆ حرا ڈیئر! آپ کی تحریریں اکثر و بیشتر شائع ہوتی رہتی ہیں، مزید تحریریں بھیجیں۔ اب ناراضی کس بات کی......؟

مجھے تعلیم و تربیت پڑھتے تقریباً ایک سال ہو گیا ہے مگر میں خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کر رہی ہوں۔ تعلیم و تربیت بہت اچھا رسالہ ہے۔ اس سے ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ اس بار رسالے کے لیے تحریروں کے علاوہ بہت کچھ بھیج رہی ہوں۔ اُمید کرتی ہوں کہ شائع ہو گا اور ساتھ ہی کھوج لگائیے کا جواب بھی بھیج رہی ہوں۔ اُمید کرتی ہوں کہ انعام نکلے گا اور جلد پہنچے گا۔ آخر میں تعلیم و تربیت کے لیے:

حیات لے چلو ، کائنات لے چلو
چلو تو تعلیم و تربیت کو ساتھ لے چلو

اپنا بہت سا خیال رکھیے گا۔ اگر یہ خط شائع ہوا تو آئندہ بھی حاضر ہوں گے۔ اللہ حافظ! (حبہ اسرار، ساہی وال)

☆ خط لکھنے کا شکریہ، مزید تحریروں کا انتظار رہے گا۔

تعلیم و تربیت کا اگست کا شمارہ بہت ہی زبردست تھا۔ آپ اوجھل خاکے کا صفحہ بھی شائع کیا کریں۔ اس دفعہ کہانی گلاب پری اور چاندنی رات میں سانپ، ٹاپ پر رہی۔ میں بلاعنوان اور کھوج لگائیے میں حصہ لے رہی ہوں۔ آپی! پلیز، میرا نام انعامی سلسلوں میں شائع کرنا۔ خط ختم کرنے سے پہلے ایک نعرہ تو میرے ساتھ لگائیے۔ تعلیم و تربیت زندہ باد! (حمیرا خاتون، کلورکوٹ)

پیلی پیلی روشنی کمرے میں بند ہے
میں کیا کروں مجھے تعلیم و تربیت پسند ہے

☆ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

اُمید ہے کہ جناب والا بخیر و عافیت ہوں گے اور ہمارے لیے ستمبر کا شمارہ تیار کرنے میں ہمہ تن مصروف بھی۔ میرا یہ دوسرا خط ہے تعلیم و تربیت کے لیے پہلا خط اور تحریر مارچ میں ارسال کی تھی۔ خط تو شائع ہو گیا جب کہ تین ماہ گزر جانے کے باوجود تحریر ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ خیر! ایک اور مکتوب اور دو کہانیوں سمیت غائبانہ حاضر خدمت ہوں، اس اُمید کے ساتھ کہ آپ اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے "صبح خیر راغلے" کہیں گے۔ تحریریں اگر نا قابلِ اشاعت ہوں تو بھاڑ میں ڈال دیا کریں۔ اس سے ہمیں کچھ رنج نہ پہنچے گا لیکن خط ضرور شائع کیا کریں۔ کیوں کہ:

یہ بازی خطوط کی بازی ہے ، یہ بازی آپ ہی ہاریں گے
ہر گھر سے خط نکلے گا ، آپ کتنے خط پھاڑیں گے؟

بہرکیف! اب بھی اگر آپ نے پہلے کی مانند حوصلہ افزائی فرمائی تو یہ ہماری ڈوبتی کشتی کو بھنور سے بچانے کے مترادف ہو گا۔ آپ بھی مصروف ہیں اور میں بھی۔ نہ آپ کے پاس طویل مکتوب پڑھنے کا وقت اور نہ ہمارے پاس لکھنے کا وقت۔ اس لیے اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا، اللہ تعالیٰ ہمارے اس مہکتے چمن کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور یہ محاورات، کہانیوں، مضامین، لطائف، اشعار اور انسائیکلوپیڈیا کے علاوہ کئی اہم سلسلوں پر مشتمل گلستان ہمیشہ جگمگاتا رہے۔ آمین!

(محمد رجب علی، دارالعلوم کبیر والا)

☆ آپ کا خط پسند آیا۔ اپنی تحریریں بھیجیں اور فون پر رابطہ رکھیں۔

آپ کا رسالہ بہت اچھا ہے۔ میں آپ کا ماہنامہ تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میں دو سال سے آپ کی خاموش قاریہ ہوں۔ محترمہ ایڈیٹر صاحبہ! میرا یہ خط ضرور ارسال کیجئے گا۔ اگست کا شمارہ ٹاپ پر تھا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ مجھے آپ سے ایک شکایت ہے کہ نوشہرہ ورکاں میں رسالہ بہت دیر بعد پہنچتا ہے۔ مہربانی

فرما کر یہ خط ضرور شائع کیجیے گا۔ (یشفی تجلی، چوہانیاں)

گرم گرم روٹی توڑی نہیں جاتی
تعلیم و تربیت سے دوستی چھوڑی نہیں جاتی

☆ خط لکھنے کا شکریہ! تحریریں بھی بھیجیں۔ ان شاء اللہ رسالے کی بروقت ترسیل یقینی بنائیں گے۔

اگست کا شمارہ بہت رنگین تھا۔ ہر نگارشات اور تحاریر بہت پسند آئیں۔ علاوہ ازیں پورا رسالہ ہی رنگا رنگ اور دل آویز محسوس ہو رہا تھا۔ جولائی کے مہینے میں میری تحریر شائع کر کے جو حوصلہ افزائی آپ نے کی، اس کا شکریہ! میرے تمام گھر والوں نے مجھے بہت حوصلہ دیا اور مجھے یہ مشغلہ جاری رکھنے کی تلقین بھی کی۔ ایڈیٹر صاحب! اس ماہ میں نے ایک کہانی اور ایک نظم ارسال کی ہے، اُمید ہے کہ حوصلہ افزائی کی جائے گی اور مجھے شکریہ کا موقع دیا جائے گا۔ چوں کہ آج کی صدی میں بچوں کے لیے ماہنامہ رسائل و جرائد بہت قلیل پائے جاتے ہیں اور بہت ہی کم لوگ اس طرف توجہ دیتے ہیں، اس لیے بچوں کا دیگر فضول و بے مقصد مطالعے کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے، جس کے نتیجے میں ان کی صاف و معصوم ذہنیت پر منفی اثرات ہو رہے ہیں۔ ''تعلیم و تربیت'' کا اور اس کے لیے کام کرنے والوں کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اس المیے کو دُور کرنے کی جدوجہد میں پوری تندہی کے ساتھ لگے ہیں۔ اس دعا کے ساتھ خط کا اختتام کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اس عظیم کوشش کو کام یاب و کامران کرے اور تعلیم و تربیت کو مزید ترقی کی بلند منازل سے ہمکنار کرے۔ آمین! (مریم اعجاز، لاہور)

☆ خوب صورت اور رنگا رنگ خط لکھنے کا شکریہ!

میں تقریباً تین سال سے تعلیم و تربیت کی خاموش قاریہ ہوں لیکن پہلی بار خط لکھنے کی جسارت کی ہے۔ اُمید ہے آپ حوصلہ افزائی کریں گی۔ تعلیم و تربیت کا ایک حصہ اداریہ پڑھ کر مکمل ہو جاتا ہے۔ بچوں کی تربیت میں اداریے کا بڑا ہاتھ ہے۔ باقی تمام سلسلے بھی بہت دل چسپ ہیں۔ خاص طور پر اے حمید کی زندہ لاش، کھوج لگایئے، ضرب المثل کہانی میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ باقی آپ اور آپ کی پوری ٹیم کو میرا سلام۔ اگر میرا خط شائع کیا تو ایک جملہ نصیحت کا لازمی لکھیے گا، میں انتظار کروں گی۔ (عائشہ تقدیس، راول پنڈی)

☆ کام، کام، بس کام۔

یہ ماہنامہ ایسی قابل تحسین کاوش ہے جس نے ہم جیسے ست الوجود لوگوں کو بھی آپ کی تعریف میں خط لکھنے پہ اکسا دیا ہے۔ بے شک آپ کے پاس آنے والے بیشتر پیام نامے تعریف و توصیف پہ مبنی ہوتے ہیں اور تعریف آپ کے لیے عام سی بات ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس رسالے نے واقعی بچوں کے لیے تمام ادبی ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ داری بطریق احسن پوری کرنے کا جو بیڑہ اٹھایا ہے، وہ پوری بھی کر رہا ہے۔ ایک ادنیٰ سی کاوش ہم بھی کر رہے ہیں، اگر پذیرائی ملے گی تو حوصلہ بڑھے گا اور موقع بے موقع آپ کی خدمت میں بذریعہ تحریر حاضر ہوتے رہیں گے۔ ورنہ...... ورنہ کیا؟ ''ہمت مرداں، مددِ خدا'' کے مصداق پھر کوشش کرتے رہیں گے۔ (عظمیٰ رضوان، فیصل آباد)

☆ آپ مزید تحریریں بھیجیں۔ خط لکھنے کا شکریہ!

ایڈیٹر آپی! کیسی ہیں آپ؟ اُمید ہے خیریت سے ہوں گی۔ رسالہ ہمیشہ کی طرح زبردست ہے۔ میں پڑھائی میں مصروف ہو گئی تھی اس لیے شرکت نہیں کر رہی تھی لیکن اب مقابلے میں حصہ لیا کروں گی۔ سب کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو ترقی عطا کرے۔ آمین! (ثمرہ طارق بٹ، آروپ)

☆ آپ کو پھر سے خوش آمدید کہتے ہیں۔

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بہت مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

محمد عبداللہ، صوابی۔ کشف جاوید، فیصل آباد۔ منیبہ شہناز، لاہور۔ نشاء اعجاز، جوہر آباد۔ عدن سجاد، جھنگ صدر۔ سعد علی، لاہور۔ ملک محمد عمر، فیصل آباد۔ آمنہ سعید، موچھ۔ حافظہ نائلہ کرن، رحیم یار خان۔ عیشہ فاطمہ، فیصل آباد۔ شاہ زیب اللہ، محمد وقار خان، پشاور۔ طیبہ فاطمہ، صوابی۔ انس جواد، راول پنڈی۔ محمد رمیز بٹ، لاہور۔ محمد حمزہ لغاری، میانوالی۔ قریشہ فاطمہ فاروقی، محمد علی فاروقی، رحیم یار خان۔ ایم اے حجازی، لاہور۔ صدیق قیوم، قصور۔ کائنات منظور، لاہور۔ وجیہہ خلیل، گوجرانوالہ۔ عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ فائزہ رزاق، خانیوال۔ ثمن رؤف، لاہور۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ رافعہ یٰسین، سوہاوہ۔ عدن فاطمہ سلیمان، گوجرانوالہ۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ عبدالمعید قریشی، ٹیکسلا۔ مبشرہ الیاس، لاہور۔ فرحین علی خان، شاہ منصور، صوابی۔ شمائلہ ناز، محمد ضیاء اللہ، میانوالی۔ ثمرہ احمد بٹ، سیال کوٹ۔ خالد الیاس، لیہ۔ ثانیہ امتیاز، لاہور۔ غزالہ حبیب، تاندلیانوالہ۔ بشریٰ میبل، کلورکوٹ۔

افشاں آج صبح سے بہت پرجوش تھی۔ آج اس کا اسٹینڈرڈ میں پہلا دن تھا۔ نئی یونی فارم، نیا بستہ، نیا جیومیٹری بکس، نئے چمچماتے ہوئے اسکول شوز، نیا اسکول، نئی کلاس۔ ''نئے پن'' کے احساس نے اس کو گھیرے میں لیا ہوا تھا۔

''افشاں بیٹا! ناشتا تیار ہے، آجاؤ۔'' وہ آئینے کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی جب امی جان کی آواز کانوں میں پڑی۔

افشاں نے اسکارف سیٹ کر کے دوپٹہ پنوں کی مدد سے کندھے پر ٹکایا اور بیگ اُٹھا کر ڈائننگ ہال میں آگئی۔ نئے اسکول جانے کی خوشی میں اس نے جلدی جلدی ناشتا ختم کیا اور بابا جان کے ساتھ اسکول آگئی۔ اسکول کی شان دار سی عمارت کے اندر داخل ہوتے ہوئے اس کا دل فخر اور اللہ کی شکرگزاری کے احساس سے بھر گیا۔ اس اسکول کا شمار شہر کے بہترین تعلیمی اداروں میں ہوتا تھا اور ففتھ اسٹینڈرڈ میں اعلیٰ نمبروں سے کام یابی حاصل کرنے والے بچے ہی یہاں داخلے کے حق دار قرار پائے تھے۔ اسمبلی سے پہلے افشاں کی اپنی چند کلاس فیلوز سے سلام دعا ہوئی۔ اسمبلی کے بعد سب طالبات آپا کی رہنمائی میں کلاس روم میں آ گئیں۔ ففتھ تک افشاں جس اسکول میں تھی وہاں بچوں اور بچیوں کی ایک ہی کلاس ہوتی تھی مگر یہ ہائی اسکول تھا۔ یہاں بوائز سیکشن الگ تھا۔ کلاس میں سب طالبات ٹیچر کے آنے سے پہلے ایک دوسرے سے تعارفی مراحل وغیرہ طے کرنے لگیں کہ افشاں کی نظر اچانک آخری بینچ پہ بیٹھی ایک سرخ و سفید رنگت والی بچی پر پڑی۔
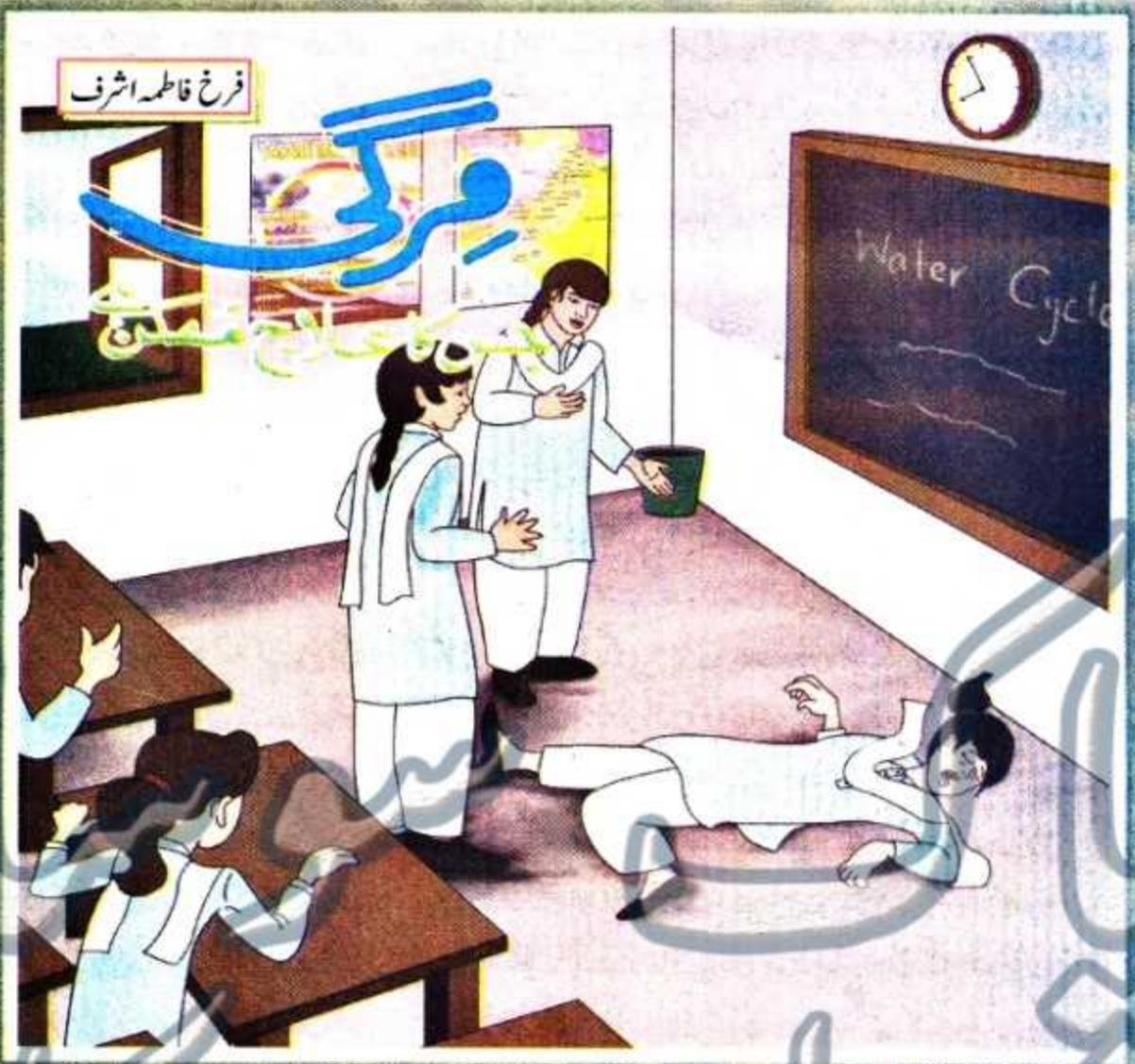
''کتنی خوب صورت اور بھولی بھالی سی لڑکی ہے، مجھے اس سے دوستی کرنی چاہیے۔'' افشاں نے دل میں سوچا۔ ابھی افشاں اس کے پاس جانے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ میڈم نکہت کلاس میں آ گئیں۔ وہ کلاس انچارج تھیں اور ان کی کلاس کا سائنس کا پیریڈ میڈم نکہت کے ذمے تھا۔

میڈم نے تعارفی مرحلہ طے کرنے کے بعد طالبات کو سائنس کی کتابیں نکالنے کا کہا تو افشاں بھی سب بھول بھال کر مگن ہو گئی۔

اگلے دن افشاں اسمبلی سے پندرہ منٹ پہلے اسکول پہنچی تو اسے اپنی ہی سرخ و سفید رنگت والی کلاس فیلو کلاس کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھی نظر آئی۔ ''السلام علیکم! میں افشاں ہوں، آپ کی کلاس فیلو۔'' افشاں نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''وعلیکم السلام! میں سائرہ ہوں۔'' اگرچہ کل میڈم نکہت کی کلاس میں تعارفی مرحلہ طے ہو چکا تھا مگر پھر بھی دونوں نے اس کا اعادہ کیا۔

ابھی افشاں سائرہ سے مزید بات چیت کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ افشاں کے لیے یہ رویہ حیران کن تھا اور پھر آنے والے دنوں میں اس نے بہت دفعہ سائرہ سے گھلنے ملنے کی کوشش کی مگر وہ بہت ڈری سہمی سی اور الگ تھلگ رہنے والی بچی تھی۔ افشاں تو کیا، وہ کسی بھی کلاس فیلو سے بات نہیں کرتی تھی۔ بریک ٹائم میں بھی ہمیشہ اکیلی ہوتی۔ کلاس میں بھی سب سے آخری بینچ پر الگ تھلگ بیٹھتی۔ دو ماہ کے عرصے میں بچیوں کی آپس میں کافی دوستی ہوگئی تھی اور کئی تو پکی سہیلیاں بھی بن چکی تھیں مگر سائرہ کی طرف جس نے بھی دوستی کا ہاتھ بڑھایا، سائرہ نے اس کی حوصلہ شکنی کی تھی۔ چھٹی کلاس کی بچیوں کے لیے سائرہ کا رویہ حیران کن تھا۔ بہرحال اتنا سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ سائرہ کا تعلق قریبی گاؤں سے تھا اور وہ حال ہی میں پڑھائی کے لیے شہر میں مقیم اپنی پھوپھو کے پاس منتقل ہوئی تھی کیوں کہ گاؤں میں اچھے معیار کا اسکول نہیں تھا۔

''ٹن ٹن ٹن......'' ہاف ٹائم کی گھنٹی بجی۔ ٹیچر ابھی چند منٹ پہلے ہی کلاس روم سے باہر گئی تھیں۔ بچیاں ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول لنچ باکسز وغیرہ نکال ہی رہی تھیں کہ اچانک ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ سائرہ جو اپنا بیگ اُٹھا کے کلاس روم سے باہر نکل رہی تھی، اچانک دروازے میں ہی گر پڑی، اس کا بیگ اور پانی والی بوتل چھوٹ کر دُور جا گرے اور اس کا جسم عجیب انداز میں جھٹکے لینے لگا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مڑ گئے اور آنکھیں بند ہوگئیں۔ سب بچیاں ڈر کر دُور دُور ہٹ گئیں۔ چند ایک کے حلق سے تو چیخیں بھی نکل گئیں۔ پانچ، چھ منٹ اسی حالت میں گزر گئے۔ کسی بچی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ جا کر سائرہ کو پکڑتی یا جا کر ٹیچر کو اطلاع دیتی۔ پانچ چھ منٹ کے بعد بالآخر سائرہ کے جسم نے جھٹکے لینے بند کیے اور وہ بالکل ساکت ہوگئی۔ افشاں کو ٹیچر نے چند روز پہلے ہی مانیٹر بنایا تھا۔ سو اس نے اسے اپنی ذمہ داری سمجھا کہ اسٹاف روم میں جا کر ٹیچر کو اطلاع کرے۔ ٹیچر کے ساتھ پرنسپل صاحب اور اسکول کی آپا بھی آ گئے اور بے ہوش پڑی سائرہ کو پرنسپل صاحب نے فی میل ٹیچرز کے اسٹاف روم میں بھجوا دیا اور ساتھ ہی ڈاکٹر کو اور سائرہ کے گھر بھی کال کر دی۔

ایک روز کی چھٹی کے بعد سائرہ نے دوبارہ اسکول آنا شروع کر دیا اور اب کی بار تبدیلی یہ آئی کہ نہ صرف وہ کلاس سے کٹی کٹی تھی بلکہ کلاس کی باقی بچیاں بھی اس سے کٹی کٹی تھیں۔ افشاں فطرتاً حساس اور رحم دل لڑکی تھی۔ اس نے سائرہ کی آنکھوں کا درد پڑھ لیا۔ بریک ٹائم میں افشاں اپنا لنچ باکس لے کر الگ تھلگ بیٹھی سائرہ کے پاس آ گئی۔

''چلو سائرہ، مل کر لنچ کرتے ہیں۔'' افشاں نے بے تکلفی سے کہا۔ سائرہ نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا مگر چپ رہی۔ افشاں نے سائرہ کی جھجک مٹانے کے لیے بریڈ کا ٹکڑا توڑ کر اس کو دیا اور اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگی۔

افشاں کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ چند ہفتوں میں سائرہ اس سے کافی گھل مل گئی تھی۔ سائرہ سے دوستی کرنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو افشاں نرم دل لڑکی تھی۔ اس سے سائرہ کا الگ تھلگ اور اداس بیٹھے رہنا برداشت نہیں ہوتا تھا۔ دوسرا اس نے سائرہ کی اس دن والی کیفیت کے بارے میں اپنے چاچو سے تفصیل سے بات کی تھی جو ڈاکٹر بن رہے تھے اور انہوں نے اسے اس بارے میں تفصیلاً سمجھایا تھا۔

''ایک بات تو بتاؤ پیاری سائرہ۔'' موقع غنیمت جان کر ایک دن افشاں نے بات نکالی۔ آج ان کا انگلش کا پیریڈ فری تھا اور وہ گراؤنڈ میں بیٹھی تھیں۔

''ہاں! پوچھو......'' سائرہ نے مسکرا کر کہا۔ افشاں کی سنگت میں اس کا ڈرا سہما انداز کافی کم ہو گیا تھا۔

''کیا جیسے اس دن کلاس میں تمہارے ساتھ ہوا، پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟'' افشاں کا اشارہ بریک ٹائم میں اس کے گرنے اور دورہ پڑنے والی کیفیت کی طرف تھا۔

''ہاں۔'' سائرہ نے سر جھکا کر کہا۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے؟'' سائرہ سے وہ بہت سوچ سمجھ کر اس انداز میں بات کر رہی تھی جیسا کہ اس کے چاچو نے سمجھایا تھا کہ سائرہ کی دل شکنی نہ ہو۔

''مجھ پر جن آتے ہیں۔'' سائرہ نے مجرمانہ انداز میں اعتراف کیا۔

''اچھا تمہیں کیسے پتا چلا کہ تم پر جن آتے ہیں؟'' افشاں نے اس کا ہاتھ تھام کر نرم انداز میں پوچھا۔

''جب میں اپنے گھر میں تھی، تب بھی میرے ساتھ کبھی کبھار ایسا ہوتا تھا اور گاؤں کے سب لوگ میرے امی ابا کو کہتے تھے کہ

تمہاری بیٹی پر جن آتے ہیں۔'' سائرہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''اور اب تو کلاس کی لڑکیاں بھی مجھے یہ کہہ کہہ کر تنگ کرتی ہیں کہ تم پر جن آتے ہیں۔'' سائرہ اب ہاتھ کی پشت سے اپنے گالوں پر لڑھک آنے والے آنسو صاف کر رہی تھی۔

''اسی وجہ سے میں کسی سے دوستی نہیں کرتی، جس کو بھی پتا چلتا ہے کہ مجھ پر جن آتے ہیں، وہ مجھ سے دوستی ختم کر دیتا ہے۔ مجھ پہ جن آتے ہیں تو اس میں میرا تو قصور نہیں ہے ناں افشاں؟'' سائرہ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ افشاں پُرسوچ نظروں سے خلا میں تکتی رہی۔ اس نے چاچو کی ہدایت کے مطابق کلاس انچارج میڈم نکہت سے بات کرنے کی ٹھانی۔

''السلام علیکم، میڈم!'' میڈم نکہت کلاس میں داخل ہوئیں تو حسب معمول چھٹی کلاس نے ان کے احترام میں کھڑے ہو کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام، بچو!'' میڈم نے اپنی ازلی میزبان مسکراہٹ سے کہا۔

''آج ہم اپنے روٹین کے سبق سے ہٹ کے کچھ پڑھیں گے۔'' حاضری کے بعد طالبات کو سائنس کی بکس نکالتے دیکھ کر میڈم نے بات کا آغاز کیا۔

''میں آپ کو ایک بیماری کے متعلق بتاؤں جس کا تعلق ہماری روزمرہ زندگی سے ہے۔''

سب طالبات دل چسپی سے میڈم کی طرف متوجہ تھیں۔ میڈم اب اپنے ساتھ لائے گئے پروجیکٹر کو آن کر کے اس کی مختلف کیز (Keys) دبا رہی تھیں۔ بالآخر انہوں نے اس پر ایک ویڈیو پلے کی۔ اسکرین پر ایک تیئس چوبیس سال کے لڑکے کی ویڈیو چل رہی تھی جو کسی اسپتال کے بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے جسم نے عجیب انداز میں جھٹکے لینے شروع کر دیئے۔ اسکرین پر دو میل نرس بھی دکھائی دے رہے تھے جو مریض کے آس پاس رکھی چیزیں تیزی سے ہٹا رہے تھے۔ چند منٹ کے بعد اس لڑکے کا وجود بالکل ساکت ہو گیا اور ساتھ ہی ویڈیو ختم ہو گئی۔ سب طالبات بشمول سائرہ دم سادھے اسکرین کی طرف متوجہ تھیں۔ اسکرین پر دکھائی دینے والے لڑکے کی بالکل وہی کیفیت تھی جیسی خود سائرہ کی اس دن ہوئی تھی۔

''ہاں تو بچیو! آپ کے خیال میں اس لڑکے کے ساتھ کیا ہوا تھا؟'' میڈم نے دھیمے لہجے میں کلاس کو مخاطب کیا۔

''میڈم اس لڑکے پر جن آتے ہیں۔'' ایک بچی فوراً بول اٹھی...... میڈم مسکرائی۔ ''نہیں میری پیاری بچیو، اس طرح کی کیفیت جن آنے کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک بیماری ہے جسے ایپی لیپسی (Epilepsy) یا عرف عام میں مرگی کہتے ہیں۔ اس کے شکار مریض میں مریض کا جسم اچانک اس طرح غیرفطری علامات کے ساتھ جھٹکے لینا شروع کر دیتا ہے کیوں کہ اس کے دماغ کے کچھ نیورانل سیل (Neuronel Cell) اچانک ہی اپنی مقررہ حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور زیادہ نیوروٹرانسمٹرز خارج کرتے ہیں جس سے مریض کو اپنے جسم کی حرکات پر قابو نہیں رہتا۔ چھٹی کلاس نے ابھی دو روز قبل ہی سائنس میں نیوروٹرانسمٹرز کے بارے میں

پڑھا تھا کہ یہ وہ کیمیکلز ہیں جو جسم میں ایک سے دوسری جگہ پیغامات کی ترسیل کا کام کرتے ہیں۔

''میڈم، کیا اپی لیپسی کے شکار ہر مریض کے ساتھ ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے؟'' افشاں نے مؤدبانہ انداز میں سوال کیا۔

''بیٹا، اس کی مختلف اقسام ہیں۔ بعض اوقات پورا جسم جھٹکے لیتا ہے اور بعض اوقات جسم کی ایک سائیڈ کے کچھ مسلز دماغ کے کنٹرول سے باہر ہوتے ہیں۔'' میڈم نے کہنے کے ساتھ ایک اور ویڈیو کو پلے کیا جس میں ایک بچہ جس کی عمر چار پانچ سال تھی، کاؤچ پر بیٹھا تھا۔ اچانک اس کی دائیں آنکھ نے پھڑکنا شروع کیا اور پھر دایاں ہاتھ اور پاؤں بھی لرزنے لگے۔ ''اس قسم کو فوکل اپی لیپسی کہتے ہیں جب کہ جس ٹائپ میں پورا جسم جھٹکے لیتا ہے اسے گرینڈ مال اپی لیپسی کہتے ہیں۔ اپی لیپسی کی وجوہات بہت سی ہیں جیسے دماغ میں ٹیومر کا بن جانا یا کچھ اضافی ٹشوز کا بن جانا، بعض اوقات یہ وراثت میں بھی منتقل ہوتی ہے۔ اپی لیپسی کے مریض کو یہ اٹیک تب ہوتا ہے جب اس کو کسی ذہنی دباؤ کا سامنا کرنا پڑے یا بعض اوقات ادویات کے استعمال، شور یا تیز روشنی کی وجہ سے بھی یہ اٹیک ہو سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کنڈیشن کے دوران مریض کے جسم کو پکڑنے کی اور زبردستی قابو کرنے کی بالکل کوشش نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ چند منٹ کے بعد یہ اثر خود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ زبردستی پکڑنے سے مریض کی کوئی ہڈی ٹوٹنے کا خطرہ ہوتا ہے اور اس دوران مریض کے پاس سے ہر وہ چیز ہٹا دینی چاہیے جس سے مریض کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔'' میڈم صاحبہ دھیمے دھیمے بولتی چلی گئیں۔ اب سب طالبات کی سمجھ میں آ گیا کہ سائرہ پر جن نہیں آتے بلکہ وہ اپی لیپسی کا شکار تھی اور ان سب کی ہمدردی اور توجہ کی مستحق تھی نہ کہ مذاق کی۔

''اور بچیو، سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپی لیپسی قابلِ علاج بیماری ہے۔ اللہ نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں کی جس کا علاج نہ ہو۔ لہٰذا ہمیں آس پاس کوئی ایسا مریض نظر آئے تو اس سے خوف کھانے یا مذاق اڑانے کی بجائے اس کی ہمت بندھانی چاہیے۔''

میڈم نے ایک پُرامید نظر سب کے چہروں پر ڈالی۔ سب طالبات نے دل میں عہد کیا کہ وہ سائرہ سے اپنے رویے کی معافی مانگیں گی اور اس کو ایک نارمل زندگی کی طرف لانے میں اس کا ساتھ دیں گی۔

☆☆☆

کھوج لگانے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

نوال شہزاد خان، لاہور۔ محمد حذیفہ علی، کوٹ سلطان۔ جویریہ آصف، اسلام آباد۔ حسان احمد، واہ کینٹ۔ کائنات منظور، لاہور۔ عدن سجاد، جھنگ۔ محمد حسین، جہلم۔ خنساء حسینی، کلور کوٹ۔ محمد شکیل بھٹی، جھنگ۔ محمد فہیم، میانوالی۔ محمد منیب ستار، سیال کوٹ۔ میرب شبیر، کراچی۔ محمد عبداللہ، صوابی۔ رمیصا گل، میانوالی۔ خدیجہ گل سید، چارسدہ۔ علیمہ ربانی، لاہور۔ پاکیزہ جاوید، فیصل آباد۔ محمد رمیز بٹ، لاہور۔ علینا اختر، کراچی۔ محمد انس جواد، ردا فاطمہ فریال، راول پنڈی۔ سیفی مجاہد حسین، ساہی وال۔ محمد عالیان، لاہور۔ سیماں کوثر، جہلم۔ وردہ زاہرہ، جھنگ۔ عروسہ رضا، راول پنڈی۔ مومنہ عامر حجازی، محمد شاہد جمعہ، لاہور۔ عیشہ فاطمہ، فیصل آباد۔ شاہ زیب اثر، پشاور۔ سامیہ رمضان، شیخوپورہ۔ عقیل احمد، اٹک۔ ایاز احمد، لاہور۔ شہیر ناصر، گکھڑ۔ وجیہہ خلیل، گوجرانوالہ۔ محمد جنید، ڈیرہ غازی خان۔ محمد بلال، لاہور۔ محمد اسد، کراچی۔ محمد صدیق قیوم، قصور۔ محمد سرمد، کھاریاں۔ اشعر الحق، راول پنڈی۔ سندس آسیہ، کراچی۔ حذیفہ مشرف، لاہور۔ محمد ظوریز، کراچی۔ حذیفہ اظہر، فیصل آباد۔ عفراء نعیم، محمد اسحاق رضا، لاہور۔ عائشہ الطاف، بہاول نگر۔ محمد قمر الزماں صائم، خوشاب۔ عائشہ حریم، کوہاٹ۔ محمد حمزہ لغاری، میانوالی۔ احمد بن قاسم، لاہور۔ ملک محمد احسن، راول پنڈی۔ ملک مظہر حسن، فتح جنگ۔ یمنہ خان، ایبٹ آباد۔ رفیق احمد ناز، ڈیرہ غازی خان۔ اسد عبداللہ، ملتان۔ فاطمہ آصف، اسلام آباد۔ عبداللہ عدیل، راول پنڈی۔ افہام علی، شیخوپورہ۔ محمد احمد خان، بہاول پور۔ فائزہ رزاق، خانیوال۔ فاطمہ طارق، اسلام آباد۔ مریم شفیق، ابراہیم آصف، لاہور۔ ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ نجم الصباح ازل، فاطمہ اختر، راول پنڈی۔ محمد عمیر عبداللہ، گوجرانوالہ۔ ثمین مقصود، لاہور۔ احسن جاوید، جھنگ۔ عائشہ ظفر، رحیم یار خان۔ مریم اعجاز، لاہور۔ ایمن مقصود، بہاول پور۔ آمنہ عرفان، راول پنڈی۔ محمد بلال، لاہور۔ احسان ضیاء الحسن، رائے ونڈ۔ علی حمزہ، راول پنڈی۔ سراج جمیل، ڈیرہ غازی خان۔ عابس بخاری، ملیحہ اعجاز، نور قریش، لاہور۔ محمد عمیس خان، ڈیرہ غازی خان۔ آمنہ عاصم، راول پنڈی۔ قریشہ فاطمہ فاروقی، رحیم یار خان۔ نور الامین، فیصل آباد۔ بشریٰ بتول، رسال پور۔ مریم نواز، فیصل آباد۔ ندیم بیگ، نوشہرہ۔ محمد سلیمان بٹ، ساہی وال۔ نفیس احمد صدیقی، نواب شاہ۔ عثمان حیدر، پشاور۔ حاشر عدیل، قصور۔ محمد سلیمان بٹ، ساہی وال۔ عثمان حیدر، پشاور۔ ایان جاوید، حیدر آباد۔ عروسہ خالد، اٹک۔ محمد زبیر ارشد، گوجرانوالہ۔ عائشہ نذیر، کراچی۔

لاہور کے ذکر کے ساتھ تاریخ مجسم ہو کر کبھی مغلیہ تو کبھی انگریز دور کی عمارتوں کی صورت میں نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔ ان شان دار عمارات نے اس شہر کو وہ شان وشوکت بخشی ہے جو بہت کم خطوں کے حصے میں آئی ہے۔ مغلیہ دور کے اسلامی طرزِ تعمیر کے شاہ کاروں نے انگریزوں کو مجبور کر دیا کہ وہ بھی یہاں ایسی تعمیرات کریں جو تاریخ کا حصہ بن جائیں۔ پنجاب پر اپنے 98 سالہ دورِ اقتدار میں برطانوی حکمرانوں نے پچاس کے قریب شان دار عمارتیں صرف لاہور میں ہی بنائیں۔ انگریزی تعمیرات کا آغاز جو 1851ء میں خوب صورت مال روڈ سے ہوا، 1938ء میں پنجاب اسمبلی کی تکمیل کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ اس طویل فہرست میں گورنر ہاؤس پنجاب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ہائی کورٹ، پنجاب اسمبلی، ریلوے اسٹیشن، جنرل پوسٹ آفس، میو اسپتال، عجائب گھر، چڑیا گھر، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، منٹگمری لارنس ہالز (قائداعظم لائبریری) گورنمنٹ کالج، میو اسکول آف آرٹس (موجودہ این سی اے) ٹولنٹن مارکیٹ شامل ہیں۔ انگریزوں نے 1840ء میں لاہور میں قبضہ کیا اور بے شمار عمارتوں کا اضافہ کیا۔ اونچے برج نما گوتھک طرزِ تعمیر پر تقریباً پچاس کے قریب عمارتیں بنائی گئیں۔ چوڑی سڑکیں، کھلے فٹ پاتھ، گھوڑوں، بگھی کے راستے دونوں جانب عمدہ قسم کے درخت لگائے گئے جو آج بھی مال روڈ کی شان میں اضافے کا باعث ہیں۔ ایچی سن کالج، ویٹرنری کالج اسپتال، ڈینٹل کالج، اسپتال جیسی نمایاں عمارات کے علاوہ انگریزی طرزِ تعمیر کا شاہ کار دیگر عمارات، تفریحی مقامات، رہائشی اسکیمیں، اسکول اور گرجا گھر آپ اپنی پہچان ہیں۔

برطانوی حکومت کے ابتدائی دور میں جو ماہر تعمیرات نمایاں نظر آتے ہیں وہ ''لالہ میلہ رام'' اور ''میاں محمد سلطان'' تھے۔ لالہ میلہ رام نے لارنس گارڈن (باغ جناح) میں ''منٹگمری لارنس ہالز'' کے نام سے پُرشکوہ عمارت تعمیر کی جو اب قائداعظم لائبریری کہلاتی ہے۔ میاں محمد سلطان کا اہم کارنامہ لاہور ریلوے اسٹیشن کی تعمیر ہے۔ اس تعمیر میں مصروف مزدوروں کو عارضی طور پر رہائش فراہم کرنے کے لیے سرائے سلطان بنوائی گئی۔ ریلوے اسٹیشن پانچ سال میں مکمل ہوا جس کے بعد اس سرائے کو لاہور آنے والے مسافروں کے لیے مستقل طور پر مخصوص کر دیا گیا۔ یہ سرائے سلطان آج بھی مسافروں کی عارضی قیام گاہ ہے۔ ریلوے اسٹیشن سے ملحقہ علاقے کو ریلوے کے افسران اور ملازمین کی رہائشی کالونی کے طور پر مخصوص کر دیا گیا۔ یہ کالونی آج بھی لاہور کی رہائشی کالونیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس دور کے ایک اور کنٹریکٹر میاں محمد بخش نے تعمیرات کے شعبہ میں نمایاں کام کیا۔ ڈیزائننگ کے حوالے سے ''سردار بھائی رام سنگھ'' کو

بہت شہرت ملی۔ تعمیرات کے شعبہ میں نمایاں مقام کے حامل سر گنگا رام نے اہم عمارتیں بنوا کر بہت نام کمایا۔

انگریز حکومت میں نہایت نمایاں حیثیت اور اہم مقام جسے حاصل ہوا، وہ سول انجینئر "رائے بہادر کنہیا لال" تھے جنہیں ایگزیکٹو انجینئر کا عہدہ حاصل تھا۔ 1866ء سے 1883ء میں وہ سپرنٹنڈنٹ انجینئر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ انجینئر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بے شمار کتابوں کے مصنف اور اُردو، فارسی زبان کے شاعر بھی تھے۔ تعمیرات اور تاریخ کے موضوعات پر تحریر کردہ ان کی تصنیفات آج بھی مستند ترین حوالے سمجھی جاتی ہیں۔

گورنر ہاؤس پنجاب کی تعمیر کی نگرانی انہوں نے ایگزیکٹو انجینئر کی حیثیت سے کی۔ اپنے اندر ایک چھوٹی سی ریاست کی خوبیاں سمیٹے یہ عمارت برطانیہ کے شاہی محلات کی طرز پر تعمیر کی گئی۔ اس میں رہائشی عمارتیں، دربار، ہالز، دفاتر، مال خانے، اصطبل آؤٹ ہاؤسز، جھیل، سرسبز لان، مصنوعی پہاڑی، اس پر بل کھاتی سیڑھیاں، یہ تمام نظارے دیکھنے والوں کو سحر زدہ کر دیتے ہیں۔ گورنر ہاؤس کے ملازمین کے لیے رہائشی کالونی بھی بنائی گئی۔ لاہور میڈیکل اسکول جسے "کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج" کا نام دیا گیا، 1881ء میں اس کی تعمیر کا آغاز ہوا جو 1882ء میں مکمل ہوگئی۔ 200x141 فٹ پر مشتمل اس عمارت کی تعمیر پر ایک لاکھ تیس ہزار روپے خرچ ہوئے۔ ٹولنٹن مارکیٹ کی تعمیر کا مقصد فنونِ لطیفہ اور صنعتی نمائش کے لیے مخصوص جگہ کی فراہمی تھا۔ 1864ء میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں پنجاب کی پہلی صنعتی نمائش منعقد کی گئی، پھر تقریباً 30 برس تک یہاں نوادرات، فنونِ لطیفہ، پنجاب کی مصنوعات، نباتات، معدنیات اور تاریخ سے متعلق کام نمائش پذیر رہا۔ مال روڈ 1851ء میں ساڑھے بارہ ہزار روپے میں تعمیر ہوئی۔ اس کی تعمیر کا مقصد لاہور کے دو کنٹونمنٹس "انارکلی" اور "میاں میر" کو آپس میں ملانا تھا۔ اس زمانے میں مال روڈ، بھاٹی دروازے اور سول سیکرٹریٹ تک محدود تھی جسے اب لوئر مال کہا جاتا ہے جبکہ موجودہ مال روڈ 1876ء تک لارنس روڈ کہلاتی تھی، بعد میں پوری سڑک "دی مال" کہلانے لگی۔

ایف سی کالج انگریزوں کا بنایا ہوا پہلا انگریزی اسکول تھا جو پنجاب میں 1848ء میں قائم ہوا۔ رنجیت سنگھ نے جب 1830ء میں کچھ پادریوں کو لاہور مدعو کیا تو ان میں پادری "جان نیوٹن" نمایاں تھے جنہیں اس زمانے کا پہلا مشنری پادری قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے ہمراہ چارلس ولیم فورمین بھی تھے جو بعد میں ان کے داماد بنے۔ ان کا مقصد انگریزی پڑھانے کا تھا۔ آغاز میں مقامی باشندوں نے انگریزی لکھنے کے تصور کو قبول نہ کیا کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ وہ انگریزوں سے جلد نجات حاصل کرلیں گے۔ ابتدائی طور پر صرف تین طالب علموں نے داخلہ لیا لیکن پھر تعداد بڑھنا شروع ہوئی اور یہ اسکول سے کالج بن گیا۔ آج یہ "فورمین کرسچن کالج" کی شکل میں جسے عرف عام میں ایف سی کالج کہا جاتا ہے، لاہور کے بہترین کالجوں میں شمار ہوتا ہے۔

سر چارلس ایچی سن نے 1885ء میں پنجاب پبلک لائبریری کا افتتاح کیا۔ لوہاری گیٹ کی حالت درست کی گئی۔ لیڈی ایچی سن

اسپتال 1887ء میں قائم ہوا۔ کوئین میری کالج کا افتتاح 1911ء میں ہوا۔ اس طرح لاء کالج، لاہور کالج برائے خواتین 1922ء میں شروع ہوئے اور لیڈی میکلیگن انجینئرنگ کالج جو کہ اب یونیورسٹی ہے، 1923ء میں تعمیر ہوئے۔ ہیلے کالج آف کامرس 1927ء میں اور لیڈی ولنگٹن کی تعمیر 1930ء میں مکمل ہوئی۔ لکشمی چوک 1943ء میں تعمیر ہوا۔ اس علاقے میں لکشمی بلڈنگ گیتا بھون (سیوک رام بلڈنگ) دیال سنگھ کالج، ٹرسٹ لائبریری اور ایشرداس بلڈنگ اپنی زبوں حالی پر نوحہ کناں ہیں۔ انگریزوں نے لاہور پر اپنا کنٹرول برقرار رکھنے کے لیے اور انتظامی افسران، مراعات یافتہ طبقے کے لیے کرشن نگر، سمن آباد اور ماڈل ٹاؤن کی بستیاں آباد کیں۔ ان بستیوں کے ساتھ ساتھ دوسری بستیاں بھی آباد ہوتی چلی گئیں۔ انگریزوں کی بنائی ہوئی بستیاں پلاننگ اور آئندہ ایک سو سال کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر آباد کی گئیں جب کہ ان بستیوں کے ساتھ ساتھ پلاننگ کے بغیر آباد ہونے والی بستیوں میں بنیادی ضروریات کا خیال نہیں رکھا گیا اور آج وہ مسائل کا گڑھ بن چکی ہیں۔ 1847ء میں انگریزوں نے لاہور کو سکھوں سے آزاد کرایا اور ایک نئے جدید لاہور کی بنیاد رکھی گئی۔ پلاننگ کے ساتھ کئی بستیاں، سرکاری عمارتیں، درس گاہیں اور اسپتال قائم کیے گئے۔ کچھ پُرانی عمارتوں کو توسیع دی گئی۔ لاہور میں تاریخی عمارتوں کی تعمیر میں لالہ میلہ رام، میاں محمد سلطان کا نام بھی نمایاں ہے۔ دونوں ماہرینِ تعمیرات نے اندرون شہر کئی عمارتوں کی بنیاد رکھی جو آج بھی اپنی اصل حالت میں موجود ہیں۔

انگریز حکمران لاہور کو تاجِ برطانیہ کا بیش قیمت نگینہ قرار دیتے تھے۔ اس لیے شان دار تعمیرات کے ذریعے اس کے حسن کو مزید نکھارنے کی کوشش کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور منفرد اور دلفریب شہر ہے جسے دو تہذیبوں کے امتزاج نے جداگانہ حسن بخشا ہے۔ ایک طرف مغلیہ عہد کی وہ عمارتیں ہیں جو ہمارے اسلاف کی شان و شوکت اور سنہری تاریخ کی امین ہیں اور دوسری طرف انگریزوں کی بنائی ہوئی پُرشکوہ عمارات ہیں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ان عمارتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس دور کی انگریزی عمارتوں میں اسکولوں اور گرجا گھروں کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔

لاہور اپنی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے پوری دُنیا میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر ورلڈ بنک نے اپنی ایک رپورٹ میں لاہور شہر کی پانچ ہزار عمارتوں کو قومی ورثہ قرار دینے کی سفارش کی تھی۔ تاہم اس کے لیے مناسب فنڈ دستیاب نہ ہو سکے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے طور پر ان عمارتوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ پوری دُنیا میں ایک سو سال سے زیادہ قدیم عمارتوں، محلوں اور بستیوں کو قومی اثاثہ قرار دے کر ان کے تحفظ کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ یونان، اٹلی، برطانیہ اور بہت سے دوسرے ممالک نے اپنی تاریخی عمارتوں کو محفوظ کرنے کے لیے بہت سے اقدامات کیے ہیں جس کے بعد یہ پوری دُنیا کے سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔

آیئے! ہم سب مل کر کوشش کریں کہ لاہور جو تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے پوری دُنیا میں الگ پہچان رکھتا ہے، اس کی پہچان کو برقرار رکھنے کے لیے حکومت کا ساتھ دیں تا کہ تاریخی عمارات اور باغات سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہیں۔

☆☆☆

بلا عنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 ستمبر 2016ء ہے۔
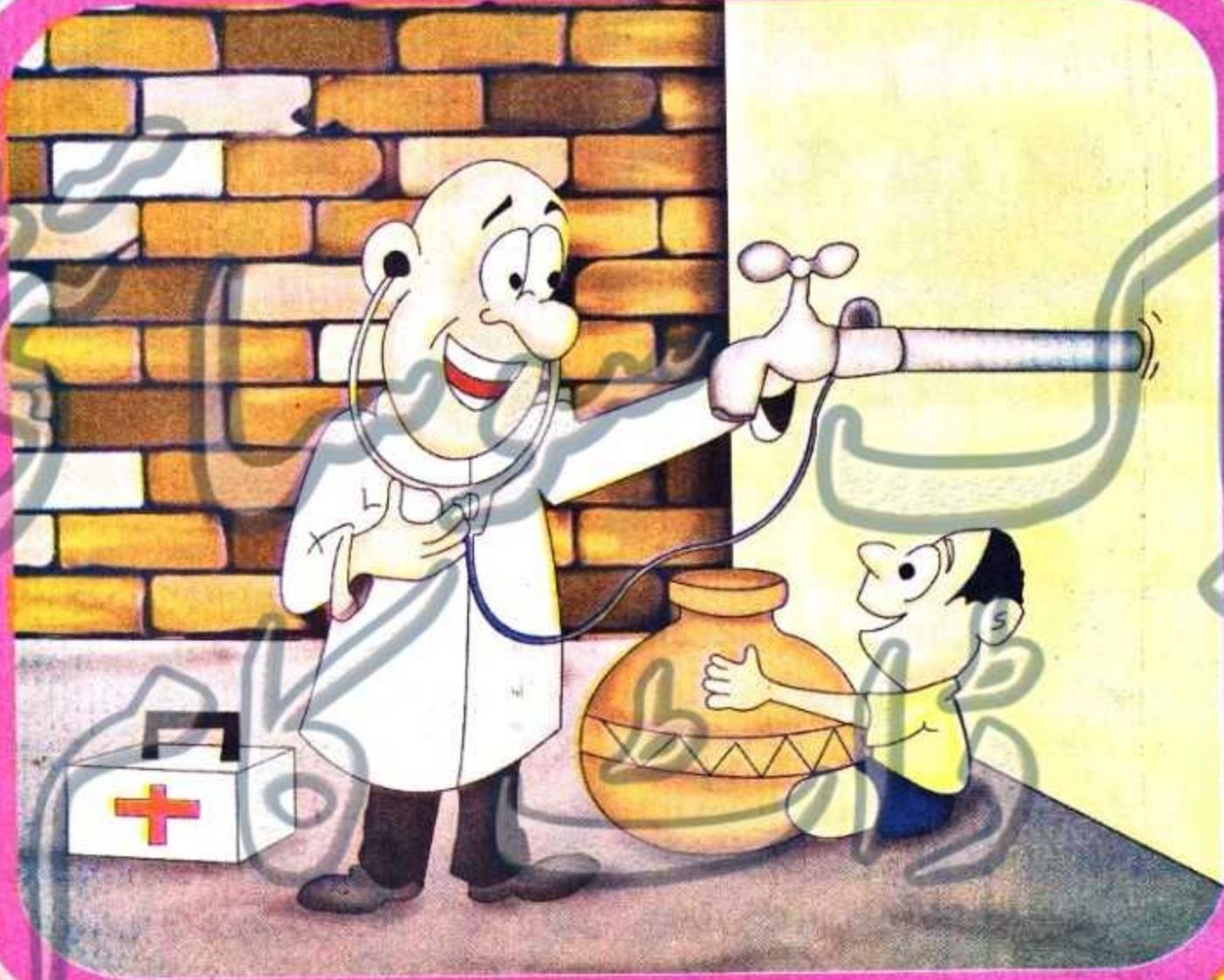
اگست 2016ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- بے شک ہمیں چڑیا چھکا ملے نہ حضور، ہم پھر بھی پنگ پانگ کھیلیں گے ضرور (انجم السحر، ملک وال)
- کھیل رہے ہیں دونوں بھائی، ہوگئی ان کی جگ ہنسائی (سامیہ رمضان اعوان، شیخوپورہ)
- جنگل میں منگل، اپنی جوتی اپنا ریکٹ (جنید انور، اوکاڑہ)
- ہم ہیں اپنی دُھن کے کھلاڑی، مت سمجھو ہمیں اناڑی (مریم اعجاز، لاہور)
- اپنی حرکتوں سے سب کو ہنسائیں گے، ریکٹ نہ ملا تو چپل سے کام چلائیں گے (کشف جاوید، فیصل آباد)

محمد زبیر جمشید، جہانیاں (پہلا انعام :195روپے کی کتب)

عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ (دوسرا انعام :175 روپے کی کتب)

فائزہ رضا، گجرات (تیسرا انعام :125 روپے کی کتب)

محمد شمعون بٹ، لاہور (چوتھا انعام :115 روپے کی کتب)

بشریٰ حسینی، کلورکوٹ (پانچواں انعام :95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: ساہ زیب، پشاور۔ راحم عمران، بہاول پور۔ مرزا احسن، فیصل آباد۔ قارہ رزاق، خانیوال۔ رافعہ سعید، راول پنڈی۔ شہیر، گکھڑ۔ رافعہ لیٰسین، جہلم۔ سراج جمیل، ڈیرہ غازی خان۔ آمنہ عرفان، راول پنڈی۔ سارہ مقصود، چکوال۔ سمیرا زاہد، کلورکوٹ۔ عروبہ عمران، فیصل آباد۔ قرنیشہ فاطمہ فاروقی، رحیم یار خان۔ فرید احمد، لاہور۔ فہیمہ، لاہور۔ کشف جاوید، فیصل آباد۔ حافظ تنزیلہ افضل، بہاول پور۔ سنیعہ جاوید چیمہ، سیال کوٹ۔ زینب گل، اسلام آباد۔ فاطمۃ الزہرا، ساہی وال۔ محمد عبداللہ ثاقب، پشاور۔ ماہ نور جابر خان، آزاد کشمیر۔ درشین، شیخوپورہ۔ آمنہ عمران، بہاول پور۔ عیشہ فاطمہ، فیصل آباد۔ خنساء حسینی، کلورکوٹ۔ مومنہ عامر حجازی، لاہور۔ ردا فاطمہ فریال، راول پنڈی۔ نعمان لیٰسین، جہلم۔ ایمان مجتبیٰ ملک، فیصل آباد۔ آمنہ بتول، چکوال۔ ساریہ نعمان، لاہور۔ عشل گل، ڈیرہ اسماعیل خان۔ آمنہ احمد، راول پنڈی۔ جویریہ آصف، فاطمہ آصف، عبداللہ آصف، اسلام آباد۔ عفرا نعیم، لاہور۔ نجم السباء ازل، میانوالی۔ امامہ یاسر، محمد بلال، لاہور۔ میرب شبیر، کراچی۔ خدیجہ گل سید، چارسدہ۔ فاطمہ احسن، کراچی۔

ستمبر کا موضوع
گائے کی قربانی
آخری تاریخ 8 ستمبر

اکتوبر کا موضوع
خوب صورت پرندے
آخری تاریخ 8 اکتوبر

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کرائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-